حیوانیہ کو نماز میں مکروہ سمجھا گیا ہے۔ اقعاء سے بھی چونکہ نبی ﷺ نے اس طرح بیٹھ کر کھڑے ہونے سے منع فرمایا تاکہ اقعاء کی شکل پیدا نہ ہو جائے۔ پس اس صورت میں جلسہ استراحت کی اس حدیث میں نفی نہیں ہوگی۔ اور دونوں حدیثوں میں موافقت ہو جائے گی۔ عبد اللہ امرتسری روپڑ ۱۹۲۵ء

قرأت کا بیان

جہری نمازوں میں جہری بسم اللہ پڑھنے کا مسئلہ

سوال :۔ کیا قرأت بالحمد کے ساتھ بسم اللہ بھی جہری پڑھے یا سری۔ اور یہ جو حدیث ہے۔ عن انس ان النبی وابابکر وعمر کانوا یفتتحون الصلوٰۃ بالحمد للّٰہ رب العلمین۔ کیا یہ صحیح ہے؟

سائل عبد الرحمٰن حصاری خطیب جامع مسجد کمالیہ

جواب :۔ بسم اللہ دونوں طرح درست ہے خواہ سری پڑھے یا جہری آہستہ پڑھنے کی دلیل ہے آپ نے بیان کی ہے۔ اور جہری کی دلیل نعیم کی حدیث ہے جو انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی سے روایت کی ہے۔ اور وہ نسائی میں ہے تفصیل کے لئے ہماری کتاب آمین و رفع الیدین ملاحظہ فرمائیں۔

عبد اللہ امرتسری روپڑی۔ ۲۵ رجب ۱۳۸۳ھ ۱۳ دسمبر ۱۹۶۳ء

پہلی دو رکعت میں جہری قرأت کی وجہ

سوال :۔ فرض نماز کی پہلی دو رکعت میں امام باواز بلند فاتحہ کے ساتھ دوسری سورۃ شامل کرکے پڑھتا ہے اور پچھلی دو رکعت خاموشی سے پڑھی جاتی ہیں۔ اور ان میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھی جاتی ہے حالانکہ فرض چار ہوں یا تین برابر درجہ رکھتے ہیں۔

جواب :۔ بلوغ المرام میں حدیث ہے پہلے نماز دو رکعت فرض ہوئی تھی پھر ہجرت کے بعد چار ہو گئی۔ فجر کی اس لئے دو رہی کہ اس میں قرأت لمبی ہوتی تھی اور مغرب دن کے وتر ہیں اس لئے اس میں ایک رکعت کم رہی۔ جب اصل نماز دو ہی تھی تو فرق کرنے کے لئے پہلی رکعتوں میں جہری قرأت کا حکم ہوا۔ اور قرأت کا بھی فرق کر دیا۔ پہلی دو میں فاتحہ اور سورۃ اور اخیر میں صرف فاتحہ۔ لیکن قرأت کا فرق حنفیہ کے نزدیک ضروری ہے۔ اہل حدیث کے نزدیک رہی یہ بات کہ دن میں جمعہ وغیرہ کے سوا جہر نہیں۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ رات کی آوازوں کی آوازیں پر جوش ہوتی ہے۔ اور جمعہ وغیرہ میں کثرت جماعت کی رعایت رکھی گئی ہے تاکہ تذکیر کا فائدہ ہو۔ عبد اللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ ۱۷ صفر ۱۳۵۳ھ ۳۱ مئی ۱۹۳۴ء

مسئلہ ارسال الیدین

یہ مسئلہ نماز کے متعلق ہے جو اپنے مقام پر درج نہیں ہو سکا۔

سوال :۔ نماز میں رکوع کے بعد قومہ میں ہاتھ باندھے یا چھوڑے جائیں؟

جواب :۔ رکوع کے بعد قومہ میں ہاتھ چھوڑے جائیں۔ چنانچہ مشکوٰۃ فصل رابع میں ہے۔

عن جریر الطبری قال کان علیؓ اذا قام الصّلوٰۃ وضع یمینہ علی رسغہ فلا یزال

كذالك حتى يركع او ان يصلح ثوبه او يحك جسده (صفة الصلوٰة)

یعنی جریر ضبی سے روایت ہے کہ جب حضرت علی نماز پڑھاتے تو دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کی کلائی پر رکھتے اور اسی حالت میں رہتے یہاں تک کہ رکوع کریں مگر یہ کہ اپنا کپڑا ٹھیک کریں یا اپنا بدن کھجلائیں۔

اس روایت میں کلمہ حتی کے ساتھ ہاتھ باندھنے کی حد رکوع بتلایا ہے اور دو حالتوں کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے ایک کپڑا ٹھیک کرنے کی حالت دوسرے بدن کھجلانے کی حالت۔ اگر رکوع سے اٹھ کر بھی ہاتھ باندھے ہوں تو عبارت یوں ہونی چاہیئے۔ فلا يزال كذالك حتى يهوى للسجود الا ان يركع او يصلح ثوبه او يحك جسده یعنی دو حالتوں کی جیسے استثناء کی ہے اس طرح رکوع کی حالت کی بھی استثناء کرتے اور ہاتھ باندھنے کی حد سجدہ کے لئے جھکنا بتاتے ——— یہ صاف دلیل ہے کہ قیام اور قومہ کا حکم ایک نہیں۔ اور تعامل امت بھی اسی کا مؤید ہے والحمد للہ علی ذالک ——— تفصیل کے لئے ہمارا رسالہ ارسال الیدین ملاحظہ ہو (عبداللہ امرتسری روپڑی)

مقتدی کا فاتحہ کے ساتھ دوسری قرأت کا پڑھنا

سوال :۔ کیا مقتدی فاتحہ کے ساتھ دوسری قرأت بھی پڑھنے کا مجاز ہے۔ نیز نوافل موکدہ میں سورہ فاتحہ کے ساتھ اور سورۃ بھی ملانی چاہیئے۔

محمد یونس مستقر چک نمبر ۸۔ ای۔ بی ڈاکخانہ قبولہ ضلع منٹگمری

جواب :۔ سری نمازیں فاتحہ کے ساتھ دوسری قرأت پڑھ سکتا ہے۔ جہری نمازوں میں مخالفت آئی ہے۔ حنفیہ کے نزدیک نوافل میں ضروری ہے۔ اہل حدیث کے نزدیک جائز ہے۔ ضروری نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

یکم جمادی الاول ۱۳۸۳ھ ۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

سورہ فاتحہ کی آیات کا تکرار

سوال :۔ ہمارے ہاں ایک مولوی صاحب سورۃ فاتحہ کا تکرار فرما رہے ہیں۔ اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ حضورؐ نے نماز تہجد میں سورہ مائدہ کے آخری رکوع کی آیات کا تکرار فرمایا ہے۔ اور خلیفہ سوم نے صبح کی نماز میں سورہ یوسف کی آیات کو تکرار سے پڑھا ہے۔ مولوی محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ نے اس کی تائید کی ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی جائے۔

(محمد حسین ڈار ڈار برادرز (رجسٹرڈ) گوجرانوالہ)

جواب :۔ تکرار کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان عام طور پر تکرار کو مسنون سمجھے اور اسی بنا پر

تکرار کرے تو یہ بدعت ہے۔ جو تعامل نبوی اور سلف کے خلاف ہے اور ایک یہ ہے کہ اتفاقی طور پر انسان کے دل میں رقت پیدا ہو جائے اور بار بار پڑھنے سے لذت آئے تو ایسے اتفاقی تکرار میں کوئی حرج نہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تہجد میں یا کسی صحابی کا تکرار اسی بنا پر ہے۔ رہا فاتحہ کا فرق سو یہ بے دلیل ہے کیونکہ جو جواز کی وجہ ہے وہ دونوں میں موجود ہے خواہ فاتحہ ہو یا غیر فاتحہ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی جامع قدس اہل حدیث لاہور

۱۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء ۱۹ جمادی الاول ۱۳۶۳ھ

قرأت میں حضورؐ کا نام سن کر درود پڑھنا

سوال :۔ اگر امام نماز میں کوئی ایسی سورۃ پڑھے جس میں حضورؐ کا نام مبارک ہو۔ مقتدی حسب عادت مقتدی ہونے کی حالت میں صلی اللہ علیہ وسلم کہدے تو کیا اس سے نماز فاسد ہو جائے گی۔

جواب :۔ مقتدی حضورؐ کا نام سن کر آہستہ سے "صلی اللہ علیہ وسلم" کہہ دے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ حدیث میں مطلق آیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سنے تو درود پڑھے۔ اس میں نماز کی حالت بھی آسکتی ہے۔ اور اگر کوئی نہ پڑھے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں دوسری حدیث لَا تَقْرَءُوْا بِشَیْءٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ اِذَا جَهَرْتُ اِلَّا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ۔ پر عمل ہو جائیگا۔ یعنی جب میں جہر سے پڑھوں تو فاتحہ کے سوا کچھ نہ پڑھو۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۸ شعبان ۱۳۷۹ھ ۔ ۲۶ فروری ۱۹۶۰ء

استماع۔ سماع۔ انصات۔ سکوت میں فرق

سوال :۔ استماع۔ سماع۔ انصات۔ سکوت میں کیا فرق ہے۔ اور ان کا حقیقی و مجازی کیا معنیٰ ہے نیز فاستمعوا کے ہوتے ہوئے انصتوا کا کیا فائدہ ہے؟

جواب :۔ استماع یہ ہے کہ انسان کسی چیز کو خوب اچھی طرح کان لگا کر سنے یعنی پوری توجہ اور قصد کے ساتھ اس لئے استماع اور سماع میں فرق کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

الاول (الاستماع) یقال لما کان بقصد لانہ لا یکون الا بالاصغاء وھو المیل

والسماع یکون بقصد و دونه۔

اس کے بعد سماع کی تعریف ان لفظوں میں بھی کی گئی ہے۔ کل ما یستلذ الانسان من صوت طیب مگر استماع کے لئے مستمع کا خاموش رہنا ضروری نہیں ہے۔ اور انصات کے لئے توجہ کے ساتھ سننا اور اس کے ساتھ خاموش رہنا بھی ضروری ہے چنانچہ لغت میں ہے۔ نصت نصتا و انصت و انتصت له سکت مستمعا لحدیثه یعنی کسی بات کو خاموش رہ کر سننا اس کا نام انصات ہے۔ کفار قرآن سنتے تو شور مچاتے کہ دل پر اس کا اثر نہ پڑ جائے اس لئے استمعوا کے بعد انصتوا کا اضافہ کیا گیا۔ یعنی شور و غل نہ کرو ممکن ہے تم پر اللہ کی رحمت ہو جائے۔ قرآن مجید کو سنتے ہوئے خاموش رہو یعنی چپ چاپ سنو گے تو بہت ممکن ہے کہ ہدایت پاکر اللہ تعالیٰ کی رحمت میں داخل ہو جاؤ۔ سورہ احقاف میں جنات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔ واذا صرفنا الیك نفرا من الجن یستمعون القرآن فلما حضروه قالوا انصتوا۔ جب ہم نے جنوں کے افراد کو تیری طرف بھیجا کہ وہ قرآن سنیں تو جب وہ اس موقعہ پر پہنچ گئے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ خاموشی کے ساتھ اس قرآن کو سنو۔

اس مقام پر بھی استماع کے بعد انصات کا اضافہ ہے کہ محض استماع کا لفظ انصات کے مقصد کو واضح نہیں کرتا حدیث میں آتا ہے۔

واذا قلت لصاحبك یوم الجمعة انصت فقد لغوت

یعنی امام جب خطبہ پڑھ رہا ہو اس وقت اگر تو نے اپنے ساتھی کو کہا کہ خاموش رہو تو تو نے لغو حرکت کی ہے۔ یہاں بھی انصات کو غیر کی بات سننے کے موقعہ پر خاموش رہنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

لفظ سکوت کا وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں خود اپنی بات سے اپنے آپ خاموش رہنا ہو۔ اس لئے محاورہ میں کہا جاتا ہے۔ تکلم الرجل ثم سکت یعنی کلام کر کے خاموش ہو گیا۔ فاذا انقطع کلامه فلم یتکلم او امحم قلت اسکت یعنی بول کر چپ ہو گیا۔ اب بول نہیں سکتا منہ بند کر دیا گیا۔ ایسے موقع پر اس کا استعمال باب افعال سے کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تکبیر کے بعد چپ ہو کر دعا افتتاح پڑھنے کو سکوت اسکات سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کان یسکت بین التکبیر وبین القرأة۔ پھر کہتے ہیں۔ یا رسول اللہ اسکاتك بین التکبیر والقرأة؟۔ ان مقاموں میں انصات کا لفظ نہیں آیا۔ لفظ انصات کے معنی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ سری نمازوں میں بھی قرأۃ مقتدی کو اس

آیت سے منع کرتے ہیں وہ اصطلاح عرب سے ناواقف ہیں۔ کما نص علیہ کیونکہ انصات اس سکوت کو کہتے ہیں جو کسی کے کلام کو سننے کے لئے کیا جائے۔ اور سکوت کا مجازی معنیٰ آہستہ کلام پڑھنا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضہ کی روایت سے ابھی معلوم ہو چکا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا، باستر (آہستہ) کو سکوت سے تعبیر کیا۔ واللہ اعلم۔

عبداللہ امرتسری روپڑ ضلع انبالہ

۱۶ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ ۔ یکم مارچ ۱۹۳۴ء

سورۃ فاتحہ خلف الامام پڑھنے کا امر ہے یا صرف خبر ہے؟

سوال: سورۃ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنا ان الفاظ میں ثابت کر دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو یہ ارشاد فرمایا ہو کہ امام کے پیچھے ہر نماز میں سورہ فاتحہ پڑھا کرو۔

جواب: کتاب القراۃ بیہقی میں یہ حدیث ہے۔

لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ خَلْفَ الْاِمَامِ۔

یعنی جو شخص امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں

لیجئے جن الفاظ کا آپ نے سوال کیا ہے اُن سے بھی یہ سخت ہیں کیونکہ آپ نے امر کا سوال کیا ہے اور یہاں سرے ہی سے نماز کی نفی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۵ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ ۔ ۷ اگست ۱۹۶۳ء

قرأت نماز میں قرآنی ترتیب کے خلاف پڑھنا

سوال: امام کا خلاف ترتیب قرآن پڑھنا تقدیم و تاخیر سے درست ہے یا نہیں۔ اور فرض نماز میں کبھی ایک مرتبہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اثناء سور توسیع متفرق رکوعات کا پڑھنا ثابت ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو آج کل پوری سورتیں نہ پڑھنا اور صرف درمیان سورۃ سے یا اول آخر سورۃ سے پڑھنا بدعت ہے یا نہیں؟

جواب: امام کا موجودہ ترتیب قرآنی کے خلاف تقدیم و تاخیر سے پڑھنا یا اثناء سورتوں سے متفرق رکوعات کا پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام سے ثابت ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری جلد اول صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷

باب الجمع بین السورتین فی رکعة بالخواتیم وبسورة قبل سورة وباول سورة - یعنی امام بخاری رح نے باب باندھا ہے کہ دو سورتیں ایک رکعت میں یا سورتوں کے اخیر کی آیتیں یا موجودہ ترتیب کے خلاف سورتوں کا پڑھنا یا سورتوں کی پہلی آیتوں کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔

اب ذیل کے دلائل سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جائز ہے ملاحظہ ہو۔ عن انس رض کان رجل من الانصار کان یومهم فی مسجد قباء الحدیث ۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک انصاری مسجد قباء میں امامت کراتا سورہ فاتحہ کے بعد پہلے قل ہو اللہ احد پڑھتا بعدہ کوئی سورہ ملاتا۔ اس پر اس کی قوم ناراض ہو کر اسے کہنے لگی تم قل ہو اللہ احد پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک اور سورۃ ملاتے ہو یہ ٹھیک نہیں۔ یا تو صرف قل ہو اللہ احد پڑھا کرو یا قل ہو اللہ احد پڑھنا چھوڑ دو۔ کوئی دوسری سورۃ پڑھا کرو۔ امام نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے۔ تمہاری مرضی ہو امامت کراؤں ورنہ چھوڑ دوں۔ قوم مجبور تھی کیونکہ ان میں افضل یہی تھا۔ جب اس قوم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوئے تو لوگوں نے اپنے امام کی حالت بیان کی۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے مقتدیوں کی بات کیوں نہیں سنتا اور تو نے ہر رکعت میں اس سورۃ کو اپنے اوپر کیوں لازم کر لیا ہے۔ جواب دیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سورہ کو دوست رکھتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ تیری یہ دوستی تجھ کو جنت میں لیجائے گی

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔

حدثنا آدم قال حدثنا شعبة قال حدثنا عمرو بن مرة قال سمعت ابا وائل قال جاء رجل الی ابن مسعود فقال قرأت المفصل اللیلة فی رکعة فقال هذا کهذ الشعر عرفت النظائر التی کان النبی صلی اللہ علیه وسلم یقرن بینهن فذکر عشرین سورة من المفصل سورتین فی کل رکعة۔

حدیث بیان کی آدم نے شعبہؒ سے۔ اس نے عمرو بن مرہ سے کہا۔ عمرو بن مرہ نے سُنا میں نے ابا وائلؒ سے وہ کہتے تھے کہ ایک آدمی حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس آکر کہنے لگا کہ میں نے آج کی رات ایک رکعت

میں مفصل سورتیں پڑھتی ہیں۔ اس پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یہ پڑھنا تیز اجلدی جلدی مثل شعر گوئی کے ہوگا۔ پھر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مفصل کی دو سورتیں ایک رکعت میں پڑھتے تھے اور میں ان دو سورتوں کو جانتا ہوں۔

سورتوں کی تعیین ابوداؤد جلد اول ص۲۰۳ مجتبائی میں مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو۔

عن علقمة والاسود قالا اتى ابن مسعود رجل فقال انى اقرأ المفصل فى ركعة فقال هذا كهذا الشعر ونثرا كنثر الدقل لكن النبىّ صلى الله عليه وسلم كان يقرأ النظائر سورتين فى ركعة والنجم والرحمٰن فى ركعة واقتربت والحاقة فى ركعة والطور والذاريات فى ركعة واذا وقعت والنون فى ركعة وسأل سائل والنازعات فى ركعة وويل للمطففين وعبس فى ركعة والمدثر والمزمّل فى ركعة وهل اتىٰ ولا اقسم بيوم القيمة فى ركعة وعم يتسالون والمرسلات فى ركعة والدخان واذا الشمس كورت فى ركعة قال ابوداؤد وهذا فى تاليف ابن مسعود رض۔

یعنی علقمہؒ اور اسودؒ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک آدمی آکر کہنے لگا کہ میں ایک رکعت میں مفصل پڑھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ مثل شعر گوئی کے ہے۔ اور مثل گرنے ردی سوکھی کھجوروں کے ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو سورتیں مقدار میں برابر کی ایک رکعت میں پڑھتے تھے سورۃ النجم و رحمٰن ایک رکعت میں۔ سورہ اقتربت والحاقۃ ایک رکعت میں۔ طور و الذاریات ایک رکعت میں واقعہ و نون ایک رکعت میں۔ سأل سائل والنازعات ایک رکعت میں۔ مطففین و عبس ایک رکعت میں۔ مدثر و مزمل ایک رکعت میں و ھل اتا ولا اقسم بیوم القیمۃ ایک رکعت میں و عم یتسالون و مرسلات ایک رکعت میں۔ دخان اور اذا الشمس ایک رکعت میں کہا ابوداؤد نے یہ عبداللہ بن مسعود کے مصحف کی بنا پر ہے۔

اِس حدیث سے دو مسئلے ثابت ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ دو سورتوں کا جمع کرنا ایک رکعت میں دوسرا یہ کہ موجودہ ترتیب قرآنی کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھنا ثابت ہوا کیونکہ ابن مسعودؓ

نے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اسی طرح اپنے مصحف میں جمع کر دیا۔

نمبر ۲ کی دلیل یعنی نماز میں سورتوں کے اخیر پڑھنے کا ثبوت

وقال قتادة فیمن یقرأ بسورة واحدة فی رکعتین او یردد سورة واحدة فی رکعتین کل کتاب اللہ عزوجل۔

یعنی قتادہ نے کہا جو شخص ایک سورۃ کو دو رکعتوں میں پڑھے یا ہر رکعت میں وہی سورت پڑھے درجا جائز ہے کیونکہ ہر ایک سورۃ میں کتاب اللہ ہی کا پڑھنا ہے۔ وجہ استدلال یوں ہے کہ جب ایک سورۃ کو دو رکعتوں میں آدھا آدھا کر کے پڑھے گا تو لا محالہ اخیر کی رکعت میں سورۃ کا اخیر ہوگا۔ جب ایک رکعت میں ایک سورۃ کا اخیر جائز ہو گیا تو دونوں رکعتوں میں دو سورتوں کے اخیر کی آیتیں یعنی قرأت بالخواتیم کے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس سورۃ میں بھی کتاب اللہ کا ہی پڑھنا ہوتا ہے جو عین مقصود شارع ہے۔ یعنی نماز میں قرآن کا پڑھنا نیز مسلم جلد اول ص۲۷۲ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اخیر بقرہ کی دو آیتیں رات کو پڑھے گا۔ اُس کو رات کی عبادت کے لئے کافی ہیں۔ یہ حدیث عام ہے نماز اور غیر نماز دونوں کو شامل ہے۔

نمبر ۳ کی دلیل یعنی موجودہ ترتیب کے خلاف تقدیم و تاخیر کرنا سورتوں کا نماز میں جائز ہے۔

قرأ الاحنف بالکھف فی الاولی وفی الثانیة بیوسف او یونس وذکر انه صلی مع عمر الصبح بھما

یعنی احنف بن قیس نے پہلی رکعتوں میں سورۃ کہف اور دوسری میں سورۃ یوسف یا یونس (شک راوی) پڑھی۔ اور ذکر کیا کہ میں نے حضرت عمرؓ کے پیچھے صبح کی نماز پڑھی۔ حضرت عمرؓ نے بھی اسی طرح یعنی پہلی رکعت میں سورہ کہف اور دوسری میں سورۃ یوسف یا سورۃ یونس پڑھی لہٰذا موجودہ ترتیب کے خلاف پڑھنا جائز ہو گیا۔

اس پہ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اُس وقت حضرت عثمانؓ کی ترتیب نہ تھی اس لئے جائز تھی۔ اب جائز نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عدم جواز کی کیا دلیل ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ عدم جواز کی دلیل نہ تو قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ اگر قرآن و حدیث میں ترتیب عثمانی کے وجوب کی دلیل اللہ کی طرف سے ہو تو صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ———— یا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم خلاف نہ کرتے

جیسا کہ مصحف ابن مسعود میں ہے۔ نہ اجماع سے عدم جواز ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ ترتیبِ عثمانی پر اجماع نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو عبداللہ بن مسعود کا مصحف نہ ہوتا۔ حالانکہ اب تک ان کا مصحف موجود ہے۔ علاوہ اس کے تقدیم و تاخیر کی وجہ سے کتاب اللہ سے خارج نہیں ہو سکتا۔ جب کتاب اللہ ہے تو جائز ہے۔ یہی مقصود شارع ہے۔ یعنی نماز میں قرآن کا پڑھنا۔

نمبر ۲ کی دلیل یعنی رکعتوں میں سورتوں کی پہلی آیتوں کا پڑھنا عن عبداللہ بن السائب قرأ النبی صلی اللہ علیہ وسلم المؤمنون فی الصبح حتی اذا جاء ذکر موسیٰ وھارون او ذکر عیسیٰ اخذته سعلة فرکع وقرأ عمر فی الرکعة الاولی بمائة وعشرین من البقرة وفی الثانیة بسورة من المثانی وقرأ ابن مسعود باربعین اٰیة من الانفال وفی الثانیة بسورة من المفصل۔ یعنی عبداللہ بن السائب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز میں سورۃ مومنون پڑھی جب آپ آیت ثم ارسلنا موسیٰ واخاہ ہارون یا آیت وجعلنا ابن مریم وامہ پہنچے تو آپ کو کھانسی شروع ہو گئی پس رکوع کیا۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے پہلی رکعت میں انفال کی چالیس آیتیں اور دوسری میں مفصل کی ایک سورۃ پڑھی۔ ان دونوں حدیثوں سے نماز میں اوائل سورتوں کا پڑھنا ثابت ہو گیا۔ وجہ استدلال یوں ہے کہ جب پہلی رکعت میں اوائل سورتوں کا پڑھنا ثابت ہو گیا تو دوسری میں اختیار ہے خواہ بقیہ کو پڑھے یا کسی اور سورت کا پہلا حصہ پڑھے یا اخیر کا حصہ پڑھے۔ بہر صورت مقصود کتاب اللہ کا پڑھنا ہے جو مقصود شارع کا ہے

عبدالقادر تسری روپڑی

۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۹ھ - ۲۷ نومبر ۱۹۵۹ء

قرآن مجید دیکھ کر امامت کرانا

سوال:۔ کیا امام جماعت کراتے وقت قرآن مجید دیکھ کر پڑھ سکتا ہے؟

بخاری شریف میں ہے کہ ام المؤمنین عائشہؓ نے اپنے غلام ذکوان کے پیچھے جو قرآن مجید دیکھ کر پڑھتا تھا نماز ادا کی ہے چنانچہ امام بخاریؒ باب امامة العبد والمولیٰ میں اس بات کو درج کیا ہے۔ اور وہ یہ الفاظ ہیں۔ کانت عائشة یؤمها عبدها ذکوان من المصحف نصر الباری۔ ترجمہ۔ صحیح بخاری کے حاشیہ پر مولوی عبدالواحد بن مولوی عبداللہ غزنوی مرحوم

نے لکھا ہے کہ نماز میں قرآن دیکھ کر قرأت پڑھنے جائز ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ ابو داؤد کتاب المصاحف میں اس بات کو موصولاً بیان لایا ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔ —— نیز عرض ہے کہ سنا ہے کہ مولانا محمد حسین بٹالوی رح تراویح کی جماعت کراتے وقت جب قرأت بھول جاتے تو قرآن مجید سے دیکھ لیتے تھے۔ اس بات کی تحقیق جب مولوی صاحب کی صاحبزادی سے کی تو معلوم ہوا کہ تہجد کے وقت وہ نوافل پڑھتے وقت قرآن مجید دیکھ کر پڑھا کرتے تھے۔

عبدالجبار خان انگلش ٹیچر بمکان مولانا ابو سعید محمد حسین بٹالوی مرحوم محلہ پوریاں بٹالہ

۶ ۲۱ یـ۲

جواب: بخاری کے حوالے سے جو روایت آپ نے ذکر کی ہے وہ سنن ابی داؤد جو صحاح ستہ سے ہے اس میں نہیں بلکہ کتاب المصاحف میں ہے جو سنن کے علاوہ ہے۔ نیز یہ روایت مسند امام شافعی مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی ہے۔ ملاحظہ ہو فتح الباری جز ۳ صفحہ ۳۷ و منتقٰی مع نیل الاوطار جلد ۳ صفحہ ۔ اس کے علاوہ قیام اللیل کے صفحہ ۹ میں امام محمد بن نصر مروزی نے بھی یہ روایت ذکر کی ہے اور اس کے علاوہ اور روایتیں بھی ذکر ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ سئل ابن شہاب رح عن الرجل یوم الناس فی المصحف قال ماذالوایفعلون ذلک منذ کان الاسلام کان خیارنا یقرؤن فی المصاحف۔

ابن شہاب زہری تابعی رح سے سوال ہوا کہ قرآن میں دیکھ کر امامت کا کیا حکم ہے۔ فرمایا ہمیشہ علماء جب سے اسلام ہوا قرآن مجید دیکھ کر کراتے رہے جو ہمارے بہتر تھے وہ قرآن مجید دیکھ کر پڑھتے تھے۔

۲۔ ابراھیم بن سعد عن ابیہ انہ کان یامرہ ان یقوم باھلہ فی رمضان ویامرہ ان یقرأ لھم فی المصحف ویقول اسمعنی صوتک۔

ابراہیم بن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اس کو حکم دیتے کہ اپنے اہل کو لے کر ماہ رمضان میں قیام کرے اور حکم دیتے کہ قرآن مجید کو دیکھ کر پڑھے اور فرماتے کہ اتنا بلند آواز سے پڑھے کہ مجھے تیری آواز سنائی دے۔

۳۔ قتادہ رح عن سعید بن المسیب فی الذی یقوم فی رمضان ان کان معہ ما یقرأ بہ فی لیلۃ والا فلیقرأ من المصحف فقال الحسن لیقرأھما

معہ ویرددہ ولا یقرأ من المصحف کما تفعل الیھود قال قتادۃ رح و
قول سعید اعجب الیّ۔

قتادہ رح سعید بن مسیب رح سے روایت کرتے ہیں جو شخص رمضان میں قیام کرے اگر اس کو اتنا قرآن مجید یاد ہو کر ایک رات کے لئے کافی ہو تو بہتر ورنہ قرآن مجید دیکھ کر پڑھ لے۔ حسن بصری رح نے کہا جو کچھ تھوڑا بہت یاد ہو اس کو بار بار پڑھتا جائے اور یہود کی طرح قرآن مجید میں دیکھ کر نہ پڑھے۔ قتادہ رح کہتے ہیں میرے نزدیک سعید بن مسیب کا قول زیادہ پسندیدہ ہے۔

۴۔ ایوب عن محمد انہ کان لا یری بأسًا ان یؤم الرجل القوم فی التطوع یقرأ فی المصحف۔

یعنی۔ ایوب رح محمد بن سیرین رح سے روایت کرتے ہیں کہ وہ نوافل میں قرآن مجید کو دیکھ کر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

۵۔ وقال عطاء فی الرجل یؤم فی رمضان من المصحف لا باس بہ۔

عطاء رح کہتے ہیں قرآن مجید میں دیکھ کر امامت کرانا کوئی حرج نہیں۔

۶۔ وقال یحیٰی بن سعید الانصاری رح لا اری بالقراءۃ من المصحف فی رمضان بأسا یرید القیام۔

یعنی یحیٰی بن سعید انصاری رح کہتے ہیں کہ رمضان میں قیام کی حالت میں قرآن مجید دیکھ کر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔

۷۔ ابن وھب سئل مالک عن اھل قریۃ لیس احد منھم جامعا القران اتری ان یجعلوا مصحفا یقرأ لھم رجل منھم فیہ فقال لا باس بہ فقیل لہ فالرجل الذی قد جمع القران اتری ان یصلی فی المسجد خلف ھٰذا الذی یقوم بھم فی المصحف او یصلی فی بیتہ فقال لا یصل فی بیتہ۔

یعنی ابن وھب رح کہتے ہیں۔ امام مالک رح سے سوال ہوا کہ ایک گاؤں میں کوئی حافظ قرآن نہیں کیا آپ کے نزدیک درست ہے کہ وہ قرآن مجید آگے رکھیں اور ان سے ایک قرآن مجید دیکھ کر پڑھ کر امامت کرائے۔ فرمایا کوئی حرج نہیں۔ پھر کہا گیا حافظ قرآن میں دیکھ کر پڑھنے والے کی اقتداء کرے یا گھر

میں نماز پڑھے۔ فرمایا گھر میں نماز پڑھے۔

۸۔ عن احمد فی رجل یؤم فی رمضان فی المصحف فرخص فیہ فقیل لہ یؤم فی الفریضۃ قال یکون ھذا؟

یعنی امام احمدؒ سے روایت ہے کہ کوئی شخص رمضان میں قرآن مجید دیکھ کر امامت کرائے تو رخصت ہے۔ کہا گیا فرضوں میں بھی امامت کرا سکتا ہے۔ فرمایا فرضوں میں یہ ہوتا ہے؟ یعنی فرضوں میں لمبے قیام کی کیا ضرورت ہے۔ ایک آدھ سورۃ ہی کافی ہے۔

۹۔ وعنہ ایضاً وقد سئل ھل یؤم فی المصحف فی رمضان قال ما یعجبنی الا ان یضطر الی ذلک وبہ قال اسحاق ؒ

یعنی امام احمدؒ سے سوال ہوا کیا قرآن مجید دیکھ کر امامت کرائے۔ فرمایا مجھے پسند نہیں مگر بضرورت کے لئے جائز ہے اور امام اسحاقؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(۱) قیام اللیل میں یہ روایت قرآن مجید دیکھ کر امامت کرانے کے متعلق ذکر کی ہے۔ اس کے بعد بعض تابعین وغیرہ سے کراہت نقل کی ہے جن سے ابراہیم نخعی کا قول ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں علماء قرآن مجید دیکھ کر امامت کرانے کو مکروہ سمجھتے تھے کیونکہ اس میں یہود سے مشابہت ہے۔

۲۔ سلیمان بن حنظلہؒ ایک قوم کے پاس سے گذرے۔ ایک شخص قرآن مجید سرپائی پر رکھ کر رمضان میں اُن کی امامت کرا رہا تھا۔ سلیمان حنظلہؒ نے قرآن مجید پرے پھینک دیا۔

۳۔ عامر شعبیؒ نے بھی اس بات کو مکروہ سمجھا کہ نماز کی حالت میں امام قرآن مجید دیکھ کر پڑھے۔

۴۔ سفیانؒ نے کہا رمضان ہو یا غیر رمضان ہو قرآن مجید دیکھ کر امامت مکروہ ہے اس میں اہل کتاب کی مشابہت ہے۔

۵۔ امام ابوحنیفہ سے روایت ہے کہ جو قرآن مجید دیکھ کر امامت کرائے اُس کی نماز فاسد ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں نے امام ابوحنیفہ کی اس میں مخالفت کی ہے وہ کہتے ہیں نماز ہو جائے گی ہاں یہ فعل مکروہ ہے کیونکہ اس میں اہل کتاب کی مشابہت ہے امام ابوحنیفہؒ کے قول کی بعض نے یہ وجہ بیان کی ہے۔ کہ قرآن مجید میں دیکھنا یہ عمل کثیر ہے۔ اور عمل کثیر سے نماز فاسد ہو جاتی ہے حالانکہ یہ دیکھنا قرأت کی خاطر ہے اور قرأت نماز میں داخل ہے اور دیکھنا بالتبع ہے جیسے اور اشیاء پر نظر پڑتی ہے۔ پس جو

شخص اس قسم کا ہلکا فعل کرے جو رسول اللہ صلی اللہ تعالے علیہ وسلم سے ثابت شدہ فعل کے مشابہ ہو یا اس کے قریب ہو۔ اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی۔ اگر حد سے گذر جائے تو فاسد ہو جائے گی اور دیکھ کر پڑھنا ثابت شدہ فعل کے قریب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک دفعہ علَم دار لوئی میں نماز پڑھی۔ آپ کا خیال لوئی کی طرف چلا گیا۔ آپ نے نماز ہی میں اُتار دی چونکہ یہ فعل نماز ہی کی خاطر تھا جس سے نماز کا بڑا جزو خشوع قائم رکھنا مقصود تھا اس لئے اس سے نماز میں کوئی خلل نہیں آیا۔ پس امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا نماز کو فاسد کہنا اس کی کوئی وجہ نہیں جس نے مکروہ جانا اس نے صرف اہلِ کتاب کی مشابہت سے مکروہ جانا ہے۔ یہ امام محمد بن نصر مروزیؒ کی تحقیق کا خلاصہ ہے۔ اُنہوں نے دونوں فریق کے اقوال سامنے رکھ دئے ہیں۔ اور امام ابو حنیفہؒ کے قول میں چونکہ کچھ زیادہ بُعد تھا اس لئے اس کی تردید کر دی۔ یہود کی مشابہت کی وجہ سے مکروہ کہنا بھی کمزور ہے۔ کیونکہ یہود کی مشابہت سے نہی اس بارے میں صراحۃً نہیں آئی۔ صرف ایک عام اُصول من تشبہ بقوم فھو منھم کے تحت داخل کر کے اس سے نہی کی جاتی ہے مگر جب اس بات کو دیکھا جاتا ہے کہ نماز کے متعلق رسول اللہ تعالے علیہ وسلم نے اتنی تفصیل کی ہے کہ کسی حکم کی اتنی تفصیل نہیں کی، ذرا ذرا سی بات بتا دی جس بات میں یہود وغیرہ کی مخالفت کی ضرورت تھی وہ بھی بتا دی۔ مثلاً سدل کرنا یعنی سر پر یا کندھوں پر چادر ڈال کر اس کی دونوں طرف کھلی ہوئی چھوڑ دینا، نماز میں پہلو پر ہاتھ رکھنا۔ جوتوں میں نماز نہ پڑھنا وغیرہ۔ تو اگر قرآن مجید کو دیکھ کر پڑھنے میں بھی مخالفت شارع کو مقصود ہوتی تو شارع کی طرف سے اس کے لئے بھی ہدایت ہوتی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ قرآن مجید دیکھ کر پڑھنا اُس عام اُصول کے تحت داخل نہیں۔ خاص کر نوافل میں، خاص کر ضرورت کے وقت کیونکہ یہود کا یہ فعل عام ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں حفظ تورات کا رواج نہیں۔ پس جب یہ اُس عام اُصول کے تحت داخل نہ ہوا تو اس وجہ سے اس کو مکروہ کہنا بھی ٹھیک نہ ہوا۔ اسی لئے قتادہ نے باوجود حسن بصریؒ سے فعل یہود ہونا نقل کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میرے نزدیک سعید بن مسیبؒ کا قول زیادہ پسند ہے اس کے علاوہ جواز کے قائلین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں جو جلیل القدر صحابیہ ہیں اور مکروہ کہنے والے صرف تابعین وغیرہ ہیں۔ پس اس وجہ سے بھی ترجیح جواز ہی کو ہے۔ مولوی محمد حسین مرحوم کا مندرجہ سوال مجھے پہلے بھی پہنچا ہے۔ غالباً وہ اسی بنا پر ہوگا ہے مشکوٰۃ باب الترجل فصل اول ص۳۸۳ ، میں ابن عباس رضی اللہ تعالے عنہ سے روایت ہے کہ جس بات میں رسول اللہ تعالے علیہ وسلم کو کوئی حکم نہ ہوتا

اس میں اہل کتاب کی موافقت درست رکھتے۔ پس اب اپنے طور پر اہل کتاب کی مخالفت تجویز کرنا کیوں کر درست ہوگا۔ پس ترجیح اسی کو ہے کہ دیکھ کر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

عبداللہ امرتسری از روپڑ ضلع انبالہ

۱۷ رمضان ۱۳۵۵ھ۔ یکم دسمبر ۱۹۳۶ء

رکوع کی رکعت ہو جاتی ہے تو سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں؟

سوال:۔ رکوع میں شامل ہونے سے اس رکعت کا ہو جانا کیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الحمد کے پڑھے بغیر ہی رکعت ہو جاتی ہے۔ کیا امام کے پیچھے الحمد پڑھنا ضروری ہے؟

جواب:۔ رکوع میں رکعت کی بابت سخت اختلاف ہے۔ اس لئے شک سے نکل جانا چاہیے جس کی صورت یہ ہے کہ رکوع کی رکعت پڑھ لے۔ اگر رکوع کی رکعت نہ پڑھے تو دو فرض فوت ہو جاتے ہیں ایک قیام، ایک فاتحہ۔ اور جو لوگ رکوع کے ملنے سے پہلے تھوڑا سا قیام کر کے رکوع میں ملتے ہیں۔ وہ حدیث کا خلاف کرتے ہیں کیونکہ بخاری وغیرہ میں ہے کہ امام کو جس حالت پر پاؤ مل جاؤ۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۲ھ۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۳ء

قرأت فاتحہ کے وقت ثناء وغیرہ نہ پڑھی جائے

سوال:۔ جب امام الحمد پڑھ رہا ہو دعا ثنا۔ سبحانک اللھم وبحمدک کب پڑھی جائے؟

جواب:۔ امام جب جہری قرأت پڑھ رہا ہو تو مقتدی سبحانک اللھم یا کوئی اور دعا نہ پڑھے۔ صرف فاتحہ پڑھے کیونکہ حدیث میں ہے لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب۔ یعنی جو شخص فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں۔ اور کتاب القرأت بیہقی میں ہے لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب خلف الامام۔ یعنی جو شخص امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں۔ واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ سے مراد فاتحہ کے سوا ہے کیونکہ فاتحہ کو حدیث نے خاص کر دیا۔ نیز یہ آیت نماز میں کلام کرنے سے نہی کے بارہ میں اتری ہے۔ عبداللہ امرتسری روپڑی ۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۲ھ

التحیات سے پہلے بسم اللہ

سوال :۔ تشہد سے پہلے بسم اللہ پڑھنا ناجائز کیوں ہے ؟

محمد رفیق ہیڈ ماسٹر ڈی۔ بی سکول شاہکوٹ براستہ قصور ضلع لاہور

جواب :۔ التحیات سے پہلے بعض روایتوں میں بسم اللہ کا لفظ آیا ہے چنانچہ کشاف القناع عن متن الاقناع جلد اول صفحہ میں حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ بسم اللہ پڑھتے تھے۔ مگر اس کی بابت تشدد نہ چاہیے کیونکہ ابن عباسؓ نے ایک شخص کو پڑھتے دیکھا تو جھڑکا۔ چنانچہ یہ بھی کشاف القناع کے صفحہ مذکور میں نقل کیا ہے۔ اور تلخیص الحبیر کے صفحہ پر بھی بسم اللہ پڑھنے کی روایتیں ذکر کی ہیں پھر ان پر بحث کی ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۲۴ جمادی الاول ۱۳۵۲ھ ۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۳ء

آمین بالجہر

سوال :۔ ایک مولوی صاحب نے مجھ پر اعتراض کیا ہے کہ تم جماعت کے ساتھ آمین پکار کر کہتے ہو۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین بالجہر کہی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ نے یہ سنت کس وقت ادا کی ہے۔ اور وہ کونسا موقعہ تھا۔ کیا حضورؐ کا یہ ارشاد ثابت ہے کہ مسلمانو تم آمین بالجہر کہا کرو۔ اس مسئلہ کی آپ وضاحت فرمائیں۔

جواب : بخاری میں حدیث ہے۔ اذا امن الامام فامنوا۔ یعنی جب امام آمین کہے تو تم آمین کہو۔ اس حدیث میں آمین کا حکم فرمایا اور بالجہر کہنا بھی ثابت ہوگیا۔ کیونکہ مقتدی جب امام کی آمین پر آمین کہے گا تو سن کر ہی کہے گا ورنہ اس کو کیا پتہ کہ امام نے آمین کہی ہے یا نہیں کہی۔ سو امام کو چاہیے کہ آمین اونچی کہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے۔

واذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین

یعنی جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

اور اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتے کہ جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آہستہ آمین کہو۔ کیونکہ امام کے آہستہ پڑھنے کی صورت میں مقتدی کو کیسے علم ہو سکتا ہے کہ امام نے غیر المغضوب علیھم و لا الضالین کس وقت پڑھا ہے بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کو اونچی پڑھے تو تم آمین کہو۔ پس ثابت ہوا کہ آمین امام کو اونچی کہنی چاہیئے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے صلوا کما رایتمونی اصلی یعنی جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھو۔ اسی طرح نماز پڑھو۔ تو گویا آپ نے فرمایا کہ تم آمین اونچی کہو۔

عبداللہ امرتسری روپڑ مدیر تنظیم ۳ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ ۱۴ مئی ۱۹۳۶ء

مقتدی کا امام کے ساتھ سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کا مسئلہ

سوال: مقتدی سمع اللہ لمن حمدہ، امام کے ساتھ کہے یا ربنا لک الحمد حدیث قولوا ربنا لک الحمد۔ صحیحین کی ہے اور سمع اللہ لمن حمدہ کہے یہ حدیث دار قطنی کی ہے۔ ان میں تطبیق دے کر افضل فعل سے مطلع فرمایا جائے۔

عبدالرحمن جھنگوی چک نمبر ۱۸۱ ر کھ برانچ لائل پور

جواب: دونوں طرح اختیار ہے۔ مقتدی سمع اللہ لمن حمدہ کہے یا صرف ربنا لک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ " پر اکتفا کرے۔ کیونکہ احادیث میں دونوں طرح آیا ہے اس لئے عمل دونوں طرح درست ہے۔

عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم روپڑ ضلع انبالہ مورخہ ۔ المحرم ۱۳۶۱ھ ۲۰ فروری ۱۹۴۲ء

مقتدی امام کے ساتھ آمین کہے یا الحمد پڑھے

سوال: حکم ہے کہ جب امام آمین کہے تو مقتدی بھی کہے۔ ایک مقتدی اس وقت جماعت میں شامل ہوا جب امام غیر المغضوب پڑھ چکا تھا تو وہ امام کے ساتھ آمین کہے یا پہلے الحمد پڑھے۔

محمد علی خطیب جامع مسجد جنڈیالہ

جواب: دونوں باتوں پر عمل کرے۔ امام کے ساتھ بھی آمین کہے اور اپنی فاتحہ ختم کر کے بھی آمین

کہے۔ پہلی آمین جو امام کے ساتھ کہتا ہے اُس کی دلیل یہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ امام جب آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ اور دوسری آمین کی یہ دلیل ہے کہ ایک شخص نے بہت عاجزی سے دعا کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس نے جنت کو یا قبولیت دُعا کو اپنے لئے واجب کر لیا اگر ختم کیا۔ ایک شخص نے عرض کی کہ کس چیز کے ساتھ ختم کیا۔ فرمایا آمین کے ساتھ مشکوٰۃ باب القرأۃ فی الصلوٰۃ فصل ۲ صلاة۔ چونکہ فاتحہ بھی دُعا ہے اِس لئے اس کو آمین کے ساتھ ختم کرنا چاہیئے تاکہ قبولیت کے مقام پر پہنچ جائے یا اس کے لئے جنت واجب ہو جائے۔

خلاصہ یہ کہ پہلی آمین امام کی فاتحہ پر ہے جس کی دلیل پہلی حدیث ہے۔ اور دوسری آمین اپنی فاتحہ پر ہے جس کی دلیل دوسری حدیث ہے۔ اِس طرح دونوں حدیثوں پر عمل ہو گیا بلکہ تینوں حدیثوں پر تیسری حدیث جس میں ہے کہ فاتحہ بغیر نماز نہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۴ شوال ۱۳۵۸ھ ۔ ۶ دسمبر ۱۹۳۹ء

بعض سورتوں کے آخر میں امام کے سوا مقتدی کا جواب دینا

سوال:۔ قرآن مجید کی جن سورتوں میں جوابات دینا حدیث میں آیا ہے۔ کیا وہ جوابات صرف امام دے یا مقتدی کے لئے بھی جائز اور مستحب ہے۔

جواب:۔ قرآن مجید کی جن سورتوں کے جوابات حدیثوں میں آگئے ہیں وہ جس طرح امام کے لئے جائز اور مستحب ہیں اسی طرح مقتدی کے لئے بھی جائز و مستحب ہیں۔ بلکہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سامعین کا جواب دینا بہت محبوب تھا۔

چنانچہ مشکوٰۃ باب القرأۃ میں ہے:۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى أَصْحَابِهٖ فَقَرَأَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةَ الرَّحْمٰنِ مِنْ أَوَّلِهَا إِلٰى اٰخِرِهَا فَسَكَتُوْا فَقَالَ لَقَدْ قَرَأْتُهَا عَلَى الْجِنِّ لَيْلَةَ الْجِنِّ فَكَانُوْا أَحْسَنَ مَرْدُوْدًا مِّنْكُمْ كُنْتُ كُلَّمَا أَتَيْتُ عَلٰى قَوْلِهٖ فَبِأَيِّ اٰلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ قَالُوْا لَا بِشَيْءٍ مِّنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ (رواہ الترمذی وقال هذا حديث غريب)

یعنی ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضہ کے پاس آئے اور سورہ رحمٰن ساری پڑھی صحابہ خاموش سنتے رہے۔ آپ نے فرمایا میں نے سورہ رحمٰن جنوں پر پڑھی تھی۔ جب بھی میں آیت فبای الاء ربکما تکذبان پر پہنچا تو وہ نہایت اچھا جواب دیتے تھے وہ کہتے لا بشئی من نعمک ربنا نکذب فلک الحمد۔ یعنی اے ہمارے رب تیری کوئی ایسی نعمت نہیں جس کو ہم جھٹلا سکیں پس تیرے لئے حمد ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بہت پیاری لگتی تھی کہ سامعین بھی جواب دیں لہٰذا مقتدی کو جواب دینا چاہیئے۔

اس حدیث میں اگرچہ ضعف ہے مگر امام شافعی رح نے اس سے استدلال کیا ہے کہ سامع بھی جواب دے امام شافعیؒ کے استدلال سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث قابلِ عمل ہے خاص کر فضائل اعمال میں۔ رہی یہ بات کہ نماز غیر نماز میں کوئی فرق ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ بظاہر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ایسا ہی سمجھ لینا چاہیئے جیسے امام کی آمین کے ساتھ آمین کہی جاتی ہے کیونکہ سماع قرأت کو دخل نہیں۔ پس اس کا آمین پر قیاس صحیح ہے۔

عبد اللہ امرتسری تنظیم اہلحدیث

۱۲ جمادی الاول ۱۳۸۲ھ۔

مقتدی فاتحہ کے سوا دوسری قرأت بھی پڑھ سکتا ہے

سوال:۔ مقتدی کو امام کے پیچھے حالتِ قیام میں سورہ فاتحہ کے سوا اور بھی کچھ پڑھنا چاہیئے۔ یا نہیں؟ نیز نوافل مؤکدہ میں فاتحہ کے بعد ہر رکعت میں کوئی سورۃ ملانی چاہیئے یا نہیں؟

محمد یونس ۷۰۔ ای۔ بی ڈاکخانہ تبور ضلع منٹگمری

جواب:۔ سری نماز میں پڑھ سکتا ہے۔ جہری میں ممانعت آئی ہے۔ مشکوٰۃ۔ حنفیہ کے نزدیک ضروری نوافل میں ہے۔ اہل حدیث کے نزدیک جائز ہے ضروری نہیں۔

عبد اللہ امرتسری روپڑی یکم جمادی الاول ۱۳۸۳ھ۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

کم سے کم قرأت کا مسئلہ

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز میں کم از کم تین آیات ضروری ہیں۔ کیا ان کا یہ قول درست ہے؟

جواب: جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نماز میں کم از کم تین آیتیں ضروری ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنتوں میں پہلی رکعت میں آیت کریمہ قولوا امنا باللہ وما انزل الینا پڑھتے تھے اور دوسری رکعت میں قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا پڑھتے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ساری رات آپ نے ایک آیت کے ساتھ قیام کیا (مشکوٰۃ قیام اللیل) یہ اگرچہ نفلوں میں ہے لیکن فرضوں نفلوں میں اس میں کوئی فرق ثابت نہیں۔ بلکہ کئی احادیث اس قسم کی آئی ہیں کہ صرف فاتحہ ہی کافی ہے چنانچہ ہم نے اپنے عربی رسالہ جواب فصل الخطاب کے ص۱۱، ص۱۲ میں ان روایتوں کا ذکر کیا ہے۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۶ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ - ۹ اگست ۱۹۳۳ء

رکوع کا بیان

سوال: رکوع کرنے کا طریقہ کیا ہے اور اس میں تسبیح کتنی مرتبہ پڑھنی چاہیئے؟

جواب: رکوع کو جاتے وقت اللہ اکبر کہتا ہوا ہاتھ اٹھائے جیسا کہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھائے تھے۔ رکوع کو جائے اور کمر کو اچھی طرح جھکائے۔ رکوع میں سر کو بہت نیچا نہ کرے اور نہ اونچا کرے بلکہ کمر کے برابر سیدھا رکھے۔ دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر اچھی طرح جگہ دے۔ گھٹنوں کو پکڑے اور انگلیوں کو کشادہ رکھے اور کہنیوں کو پہلوؤں سے دور کر کے اس طرح تن کر رکھے کہ گویا چلہ کمان ہے (ابو داؤد ترمذی)۔ رکوع میں سبحان ربی العظیم کہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں سبحانک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی بھی کہتے۔ بعض دعائیں اور بھی آئی ہیں۔ اگر کوئی پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکوع، سجدہ دس تسبیح قدر ہوتا تھا۔ اور ایک ضعیف روایت میں سبحان ربی العظیم کم از کم تین مرتبہ بھی آیا ہے۔ حضرت علی رضہ فرماتے ہیں کہ اگر مجبوری ہو تو تسبیح ایک مرتبہ بھی کافی ہے۔

رکوع کی رکعت

سوال: علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں رکوع کی رکعت نہ ہونے کو ترجیح دی ہے، مگر انہوں نے

اپنے فتاویٰ "الفتح الربانی" میں جمہور کے مذہب کو ترجیح دی ہے کہ رکوع میں رکعت ہو جاتی ہے۔ اور اس بارہ میں انہوں نے مرفوع روایات بھی بیان کی ہیں۔ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

(ایک سائل)

جواب:- علامہ شوکانی رحمہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کی بنا انہوں نے حسب ذیل حدیث ابوہریرہ رضہ پر رکھی ہے۔

مَنْ اَدْرَكَ مَعَ الْاِمَامِ رَكْعَةً قَبْلَ اَنْ يُّقِيْمَ صُلْبَهٗ فَقَدْ اَدْرَكَهَا۔

یعنی جو شخص امام کے پیچھے پیٹھ سیدھا کرنے سے پہلے امام کے ساتھ رکعت پالے اس نے رکعت پالی۔

اس حدیث کو ابن عدی اور بیہقی رحہ نے ضعیف کہا ہے۔ ملاحظہ ہو منتخب العمال جلد ۳ صفحہ ۲۵۶۔ نیز اس حدیث کے راوی ابوہریرہ رضہ کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔

حافظ ابن حجر رحہ تلخیص میں لکھتے ہیں۔

حدیث ابی ہریرۃ من ادرک فی الرکوع فلیرکع معہ ولیعد الرکعۃ البخاری فی القرأۃ خلف الامام من حدیث ابی ہریرۃ انہ قال اذا ادرکت القوم رکوعا لم یعتد بتلک الرکعۃ و ہو المعروف موقوف واما المرفوع فلا اصل لہ

(تلخیص الحبیر صفحہ ۱۲۷)

یعنی ابوہریرہ رضہ فرماتے ہیں جو شخص امام کو رکوع میں پائے تو اس کے ساتھ رکوع کرے اور اس رکعت کو لوٹائے۔ امام بخاری رحہ نے جزء القرأۃ میں اس حدیث کو ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ جب تو جماعت کو رکوع میں پائے تو اس کا اعتبار نہیں۔

جب حضرت ابوہریرہ راوی حدیث رکوع میں رکعت کے قائل نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ روایت ٹھیک نہیں، ورنہ صحابی رضہ سے یہ بعید ہے کہ راوی ہو کر صریح حدیث کا خلاف کرے۔

رکوع رکعت کے بارہ میں بعض لوگ ابوبکرہ کی حدیث بیان کرتے ہیں۔ جو ابوداؤد میں ہے وہ حدیث بھی ضعیف ہے۔ چنانچہ امام بیہقی رحہ معرفت میں ابوبکرہ[1] کی حدیث پر لکھتے ہیں۔

---

[1] ابوبکرہ کی حدیث وہ ہے جس میں ذکر ہے کہ ابوبکرہ رضہ نے صف سے دور سے رکوع کر لیا اور اسی حالت میں چل کر صف میں مل گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد فرمایا اللہ تیری حرص زیادہ کرے آئندہ ایسا نہ کرنا (مشکوٰۃ باب الموقف)

وفی ذالك دلالة علی ادراك الرکعة بادراك الرکوع وقد روی صریحا عن ابن مسعود وزید بن ثابت وابن عمرو فی خبر مرسل عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفی خبر موصول عنه غیر قوی اما المرسل فرواہ عبد العزیز بن رفیع عن رجل عن النبی صلی اللہ علیه وسلم واما الموصول فاخبرناہ ابو عبد اللہ الحافظ قال اخبرنا الحسین بن الحسین بن ایوب قال حدثنا ابو یحیٰی بن میسرة قال حدثنا ابن ابی مریم قال حدثنا نافع بن یزید قال حدثنا یحیٰی بن ابی سلیمان عن زید بن ابی عتاب وسعید بن ابی سعید المقبری عن ابی هریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اذا جئتم الی الصلوٰة ونحن سجود فاسجدوا ولا تعدوها شیئا ومن ادرك الرکعة فقد ادرك الصلوٰة تفرد به یحیٰی بن ابی سلیمان هذا ولیس بالقوی (التعلیق المغنی علی سنن دارقطنی ص۱۳۲)

یعنی ابوبکرہؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رکوع میں ملنے سے رکعت ہو جاتی ہے۔ اور ابن مسعودؓ زید بن ثابت اور ابن عمرؓ کا صریح فتویٰ اس کی بابت مروی ہے اور ایک مرسل حدیث اور ایک موصول غیر قوی حدیث بھی اس کی بابت آئی ہے۔ مرسل حدیث کو عبد العزیز بن رفیع نے ایک شخص سے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور موصول حدیث ابوہریرہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز کو آؤ اور ہم سجدہ میں ہوں تو اس کو کچھ نہ سمجھو اور جو رکعت پالے اس نے نماز پالی۔ اس حدیث کی اسناد میں یحییٰ بن ابی سلیمان راوی ہے جو قوی نہیں۔

اِس عبارت میں امام بیہقی نے یحییٰ بن ابی سلیمان کے ضعف کی تصریح کی ہے۔ پس علامہ ذہبی کا یہ کہنا کہ کسی امام کی جرح اس پر مذکور نہیں یہ ٹھیک نہیں۔ ہاں امام بیہقی نے جرح مفسر نہیں کی یعنی ضعف کی وجہ نہیں بتائی مگر اس کے مقابلہ میں کوئی زبردست توثیق بھی نہیں کی اس لئے اس حدیث کی صحت کوئی پوری تسلی بخش نہیں۔ اس کے علاوہ ابوہریرہ رضؓ اِس حدیث کے راوی اس کے خلاف ہیں۔ چنانچہ ابھی گزرا ہے۔ نیز رکعت یعنی رکوع لینا خلاف ظاہر ہے۔ بڑی دلیل اس حدیث میں رکعت سے رکوع مراد ہونے کی یہ پیش کی جاتی ہے کہ رکعت سجدہ کے مقابلہ میں ہے لیکن عبد العزیز بن رفیع کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ سجدہ کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ ایک شخص سجدہ میں آکر شامل ہوا تھا تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سجدہ کو کچھ

نہ سمجھو۔ گویا سجدہ کا ذکر رکعت سے مقابلہ کے طور پر نہیں بلکہ موقعہ ومحل کے لحاظ سے ہے اور رکعت اپنے معنی پر ہے۔

عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کا جواب بھی یہی ہے۔ مولوی انور شاہ نے فصل الخطاب میں عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث سے رکوع میں رکعت ہونے پر استدلال کیا ہے۔ ہم نے اس کا جواب یہی دیا ہے کہ سجدہ کا ذکر موقع ومحل کے لحاظ سے ہے اور رکعت اپنے معنی پر ہے۔ آپ نے بیہقی سے عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کی دو سندیں ذکر کی ہیں۔ پھر دونوں سندوں کے راویوں کی توثیق کی ہے۔ لیکن دونوں سندوں میں ایک ایک راوی چھوڑ دیا ہے۔ اس کی توثیق نہیں کی۔ پہلی سند میں محمد بن احمد بالویہ کی بابت کچھ نہیں لکھا۔ اور دوسری سند میں ابوطاہر فقیہ کی بابت کچھ نہیں لکھا۔ مولوی انور شاہ نے اس کو مطالب عالیہ سے ایک اور سند سے ذکر کیا ہے اور اس کی تصحیح بھی نقل کی ہے۔

چنانچہ لکھتے ہیں:۔

وفیہ مرفوع قال الحافظ فی المطالب العالیۃ قال مسدد حدثنا یحیی عن سفیان حدثنی عبدالعزیز بن رفیع عن شیخ من الانصار قال ان رجلا دخل المسجد فسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خفق نعلیہ فلما سلم قال کیف ادرکتنا قال سجودا فسجدت قال کذالک فافعل ولا تعتدوا بالسجدۃ مالم تدرکوا الرکعۃ فاذا رأیتم الامام قائما فقوموا وراکعا فارکعوا و ساجدا فاسجدوا وجالسا فاجلسوا صحیح وھو عند اخرین ایضا وانما نقلہ عن المطالب لتصحیحہ ایاہ وما قالہ البیہقی فی المعرفۃ انہ مرسل فانہ یرید مالم یسم صحابیہ (فصل لا یعلم من الصحابۃ الا حث)

رکوع میں رکعت ہونے کی بابت ایک مرفوع حدیث آئی ہے۔ حافظ رح نے مطالب عالیہ میں کہا ہے مسدد بن مسرہد کہتے ہیں ہمیں یحیٰی بن سعید قطان نے حدیث سنائی ہے انہوں نے کہا ہمیں سفیان بن عیینہ نے حدیث سنائی ہے۔ انہوں نے کہا ہمیں عبدالعزیز بن رفیع نے حدیث سنائی ہے وہ ایک شیخ انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جوتوں کی آواز سنی۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا تو نے ہمیں کس حالت میں پایا؟ کہا سجدہ میں پس میں نے

سجدہ کیا۔ فرمایا اس طرح کیا کرو اور سجدہ کو شمار میں نہ لاؤ جب تک رکعت نہ پاؤ۔ جب امام کو قیام کی حالت میں پاؤ تو قیام میں شامل ہو جاؤ۔ اگر رکوع میں پاؤ تو رکوع میں شامل ہو جاؤ۔ اگر سجدہ میں پاؤ تو سجدہ میں شامل ہو جاؤ۔ اگر بیٹھے پاؤ تو بیٹھ جاؤ۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ یہ حدیث اور محدثین نے بھی ذکر کی ہے۔ لیکن میں نے اس کو مطالب عالیہ سے اس لئے نقل کیا ہے کہ حافظ نے مطالب عالیہ میں اس کو صحیح کہا ہے۔ اور بیہقی کا معرفہ میں اس کو مرسل کہنا اس سے مراد ہے کہ صحابی کا نام نہیں لیا گیا میں نے اس کا جواب الکتاب المستطاب فی جواب فصل الخطاب میں لکھا ہے۔

قولہ۔ ولا تعتدوا بالسجدۃ ما لم تدرکوا الرکعۃ الخ ذکر السجدۃ باعتبار المورد والرکعۃ علی معناھا قولہ ما لم یسم صحابیہ الخ ھذا لیس معنی الارسال ثم لم یعلم ان الشیخ الذی لم یسم صحابی اولا فتامل فیہ

(الکتاب المستطاب ص۲۵۔ ص۲۵)

یعنی سجدہ کا ذکر موقع و محل کے لحاظ سے ہے اور رکعت اپنے معنی پر ہے اور بیہقی کے کلام میں مرسل سے یہ مراد لینا کہ اس کے صحابی کا نام نہیں لیا گیا۔ یہ مرسل کا معنی نہیں (مرسل کا معنی یہ ہے کہ تابعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرے اور صحابی کا ذکر چھوڑ دے) پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ شخص انصاری جس کا نام نہیں لیا گیا صحابی ہے یا نہیں اس میں تامل کر۔ ہمارے اس اخیر کے فقرے (اس میں تامل کر) سے اس طرف اشارہ ہے کہ ظاہر عبارت سے صحابی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ پورا اطمینان نہیں دوسرے ایک اور روایت کی طرف اشارہ ہے جس میں تصریح ہے کہ یہ شخص انصاری صحابی ہے۔

عون المعبود میں ہے۔

اخرج ابن ابی شیبۃ عن عبد العزیز بن رفیع عن رجل من اھل المدینۃ من الانصار عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ سمع خفق نعلی وھو ساجد فلما فرغ من صلوتہ قال من ھذا الذی سمعت خفق نعلیہ فقال انا یا رسول اللہ قال فما صنعت قال وجدتک ساجدا فسجدت فقال ھکذا فاصنعوا ولا تعتدوا بھا من وجدنی راکعا او قائما او ساجدا فلیکن معی علی حالتی التی انا علیھا ۔ (عون المعبود جلد اول ص۳۳۵)

ابن ابی شیبہ نے عبدالعزیز بن رفیع سے روایت ذکر کی ہے وہ ایک شخص انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدے کی حالت میں میرے جوتے کی آواز سنی؟ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا وہ کون شخص تھا جس کے جوتے کی میں نے آواز سنی؟ کہا یا رسول اللہ میں ہوں۔ فرمایا تو نے کیا کیا؟ کہا میں نے آپ کو سجدہ میں پایا پس سجدہ کیا۔ فرمایا اسی طرح کرو۔ اور سجدہ کو شمار میں نہ لاؤ جو مجھے رکوع میں یا قیام میں یا سجدے میں پالے تو میرے ساتھ اسی حالت میں شامل ہو جائے جس حالت میں میں ہوں

اس روایت میں تصریح ہے کہ یہ شیخ انصاری صحابی ہے کیونکہ یہ واقعہ اسی کا ہے۔ اور اسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ میں پایا ہے۔ اب بیہقی کا اس کو مرسل کہنا یا تو اس وجہ سے ہے کہ بیہقی کو یہ روایت معلوم نہیں ہوئی۔ یا یہ روایت صحت کو نہیں پہنچی یا صحابی کا مجہول ہونا بھی ان کے نزدیک صحت کو مانع ہو اس لئے انہوں نے شیخ انصاری کے ذکر کو کالعدم قرار دے کر حدیث پر مرسل ہونے کا حکم لگا دیا۔ اور صرف صحابی کا نام نہ ذکر ہونے سے مرسل کہنا جیسے انور شاہ کا خیال ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ کیونکہ نہ تو یہ مرسل کا معنی ہے نہ اس کی یہ مراد ہے۔ بلکہ مرسل سے مراد ان کی موصول[1] کے مقابلہ میں ہے۔ چنانچہ التعلیق المغنی کے حوالے امام بیہقی کی عبارت گذر چکی ہے جس میں انہوں نے مرسل کو موصول کے مقابلہ میں ذکر کیا ہے۔ اور چونکہ ابن ابی شیبہ کی روایت کی صحت میں ہمیں بھی شبہ ہے اس لئے ہم نے اس میں تامل کر کے فقرے پر اکتفا کی اور کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ موصول ہے یا مرسل ہے اگر واقعی مرسل ہے تو حافظ صاحب کا اس کو صحیح کہنا اس سے صرف اسناد کی صحت مراد ہوگی۔ اور اگر موصول ہو تو حدیث بلا شک و شبہ صحیح ہوگی لیکن اس حدیث کے معنی میں شبہ ہوگا کہ رکعت سے مراد رکوع ہے یا رکعت ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ رکعت سے رکعت ہی مراد ہے جس میں کئی وجہیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ رکعت کو رکوع کے معنی میں لینا تاویل ہے جو بغیر دلیل کے درست نہیں۔ اور بیہقی کی جس روایت میں رکوع کی تصریح ہے اس کی صحت معلوم نہیں۔ نیز اس روایت بالمعنی کا احتمال ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ کسی راوی نے رکعت کے معنی رکوع کے سمجھ کر رکعت کی جگہ رکوع کا لفظ بول دیا ہو۔ چنانچہ روایت کا اختلاف بتلا رہا ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہو سکتی ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث جو اسی کے قریب ہے۔ اس لئے رکعت بمعنی رکوع لینا صحیح نہیں کیونکہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے خلاف ہیں۔ پس اس حدیث کا

---

[1] موصول وہ حدیث ہے جس میں کوئی راوی (صحابی وغیرہ) چھوٹا ہوا نہ ہو۔ ۱۲

معنی اس کے موافق ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ رکوع میں رکعت ہونے کی نسبت کوئی تسلی بخش دلیل نہیں۔ اور ادھر دو فرض (قیام اور سورۃ فاتحہ) چھوٹتے تو پھر انسان اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈالے۔ ہاں عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ سے رکوع میں رکعت ہونے کی تصریح ہے۔ وہاں ان سے صف کے ورے رکوع کر کے صف میں شامل ہونے کا بھی ذکر ہے جسے التعلیق المغنی کے صفحہ ۱۳۱ میں بحوالہ بیہقی ذکر کیا ہے حالانکہ صف کے ورے رکوع ہونا منع ہے۔ چنانچہ پرچہ تنظیم اہل حدیث یکم اگست ۳۳ء میں مولوی احمد حسین کا مفصل مضمون اس کی بابت درج ہو چکا ہے ہاں رکوع میں رکعت ہونے کے مسئلہ میں فریقین کے لئے تشدد مناسب نہیں کیونکہ یہ اختلاف سلف کی حدود میں ہے۔ واللہ الموفق عبداللہ امرتسری

۲۴ جمادی الاول ۱۳۵۲ھ۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء

تعاقب:۔ محدث روپڑی نے جو جواب دیا ہے اس پر مولوی عبدالجلیل سامرودی نے تعاقب کیا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

محدث روپڑی نے فرمایا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضؓ جو راوی حدیث ہیں وہ خود رکوع کی رکعت کے قائل نہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت ٹھیک نہیں۔

مولوی عبدالجلیل صاحب نے تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے راوی کا اپنی روایت کردہ روایت کے خلاف عمل کرنا فتویٰ دینا روایت کا مجروح۔ غیر مستند منسوخ حسن ظن راوی پر کرتے ہوئے قرار دینا محدثین کا مسلک نہیں ہے بلکہ متقدمین حنفیہ کا یہ مذہب ہے۔ چنانچہ امام حازمی ناسخ منسوخ صفحہ ۔۔ میں بعد علامات فسخ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وعند الکوفیین زیادات اخر نحو حسن الظن بالراوی۔

یعنی علامات فسخ میں کوفیوں نے حسن ظن راوی کو بھی بڑھایا ہے۔

طحاوی نے کتے کے منہ ڈالے برتن کو سات بار دھونے کی حدیثوں کو ابوہریرہؓ کے قول تین بار دھونے سے منسوخ قرار دیا ہے۔

فاضل شوکانی نے ارشاد الفحول میں بیان کیا ہے۔

ولا یقدح رای الخبر اعمل الراوی بخلافہ خلافا للجمہور والحنفیۃ

ولبعض المالكية لانا متعبدون بما بلغ الينا من الخبر ولم نتعبد بما فهمه الراوی ولم يات من قدم عمل الراوی على رواية بحجة تصلح للاستدلال بها۔

یعنی عمل راوی کا حدیث کے خلاف ہو تو اس سے حدیث میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ برخلاف جمہور حنفیہ کے اور بعض مالکیہ کے۔ کیونکہ ہم حدیث پر عمل کے مامور ہیں نہ اس کے مقابلہ میں فہم راوی پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ اور جس نے عمل راوی کو حدیث پر مقدم کیا ہے اس کے پاس کوئی قابل قبول دلیل نہیں الخ

ماحصل یہ ہے کہ راوی کا عمل اپنی روایت کردہ حدیث کو ضرر نہیں پہنچاتا۔ اور اس سے حدیث میں کسی قسم کی خامی نہیں آسکتی۔ اور نہ ہی اس کے عموم کا مخصص ہو سکتا ہے۔ اُمید ہے اس سے رجوع فرمائیں گے۔

محدث روپڑی کا جواب

مولوی عبدالجلیل صاحب نے میرے مضمون کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ اس حدیث ابو ہریرہؓ کو جس میں رکوع کی رکعت کا ذکر ہے ابن عدی اور بیہقی نے ضعیف کہا ہے۔ منتخب کنز العمال جلد ۳ صفحہ ۲۵۔ اس کے بعد اس کی تائید میں میں نے لکھا ہے کہ علاوہ ازیں اس حدیث کے راوی ابو ہریرہؓ کا فتوٰے اس کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں جو شخص امام کو رکوع میں پائے تو اس کے ساتھ رکوع کرے اور اس رکعت کو لوٹائے۔ تلخیص الحبیر صفحہ ۱۲۶۔

جب ابو ہریرہؓ راوی حدیث رکوع میں رکعت کے قائل نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ روایت ٹھیک نہیں میری اس عبارت کا مطلب واضح ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی مخالفت سے اس حدیث کے ضعف کو تقویت ہو گئی۔ اور ظاہر ہے کہ ضعیف حدیث کسی کے نزدیک قابل حجت نہیں۔

مولوی عبدالجلیل نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے اور اس صورت میں راوی اس کا خلاف کرے تو صرف اتنے سے یہ حدیث منسوخ یا متروک نہیں ہوگی۔ بتلائیے یہ میرے مضمون پر تعاقب ہے یا اپنی طرف سے نئے مضمون کی طرح ہے۔ مولوی عبدالجلیل صاحب آپ تو ماشاءاللہ سمجھدار آدمی ہیں پھر اتنی بے احتیاطی کیوں کرتے ہیں۔ خدا آپ کے علم و عمل میں برکت دے۔ آپ اعتراض جمانے کی بجائے سمجھنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اس سے انشراح صدر حاصل ہوتا ہے۔ دیکھئے جلد بازی میں آپ نے

معمولی بات میں کیسی ڈبل غلطی کی ہے۔

علاوہ ازیں راوی کے مخالف ہونے کی صورت میں حدیث کو منسوخ یا متروک کہنا یہ بے شک حنفیہ وغیرہ کا مذہب ہے لیکن اہل حدیث بھی ایسے موقعہ پر ایسے دلیر نہیں کہ بے دھڑک قول صحابی کو چھوڑ دیں آپ خیال نہیں کرتے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کے مسئلہ میں اکثر متقدمین کیا مسلک رکھتے ہیں۔ ائمہ اربعہ رح اور جمہور اسی کے قائل ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاق تین ہوتی ہیں۔ حالانکہ مسلم کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہوتی ہے۔

آئمہ اربعہ رح اور جمہور تین طلاق واقعہ ہونے کے قائل کیوں ہوئے؟ بڑی وجہ اس کی یہی ہے کہ راوی حدیث ابن عباس رض کا فتویٰ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل حدیث قول صحابی رض کو بے دھڑک نہیں چھوڑتے۔ ہاں قول صحابی اور اس کی حدیث میں موافقت کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ قول صحابی بشرط صحت حقیقت میں اس کی روایت کردہ حدیث کے مخالف ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک مجلس کی تین طلاق کی بابت ہم نے ابن عباس رض کے قول اور حدیث مرویہ کے ساتھ کئی طرح پر کر دی ہے۔ رہا ابوہریرہ رض کا فتویٰ کہ جس برتن میں کتا منہ ڈال دے اس کو تین دفعہ دھویا جائے۔ حالانکہ ان سے مرفوع روایت آئی ہے کہ سات دفعہ دھونے سے پاک ہوتا ہے تو اس کی بابت عرض ہے کہ ابوہریرہ رض سے دو طرح کا فتویٰ روایت کیا گیا ہے ایوب نے محمد بن سیرین کے واسطہ سے ابوہریرہ رض سے سات کا فتویٰ روایت کیا ہے اور عبدالملک بن ابی سلیمان نے عطاء کے واسطہ سے تین کا فتویٰ ذکر کیا ہے۔ فتح الباری جزو اول صفحہ ۱۳۹ میں ہے وھو دون الاول فی القوۃ بکثیر یعنی یہ دوسری سند پہلی سے قوت میں بہت کم ہے کیونکہ عبدالملک اگرچہ ثقہ ہے۔ لیکن غلطیاں کرتا ہے۔ تقریب میں ہے صدوق لہ اوھام یعنی سچا ہے لیکن وہمی ہے اور اصول کا یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک ثقہ اپنے سے زیادہ ثقہ کی مخالفت کرے تو اس کی وہ روایت شاذ ہوتی ہے تو اس بنا پر عبدالملک کی روایت شاذ ہوئی۔ اور شاذ ضعیف کی قسم ہے پس تین کا فتویٰ ضعیف ہوا۔ اس لئے بیہقی اپنی کتاب معرفہ میں لکھتے ہیں۔

لم یروہ غیر عبدالملک وعبدالملک لا یقبل منہ ما یخالف فیہ الثقات و عبدالملک تفرد بہ من بین اصحاب عطاء ثم اصحاب ابی ھریرۃ و

مخالفته اهل الحفظ والثقة فی روایاته ترکه شعبة بن الحجاج ولم یحتج به محمد بن اسمٰعیل البخاری فی صحیحه (التعلیق المغنی علی دار قطنی ص۶۵)

یعنی تین کا فتویٰ صرف عبدالملک نے روایت کیا ہے اور عبدالملک جس بات میں ثقوں کی مخالفت کرے اس کی وہ بات مقبول نہیں۔ اس نے اس روایت میں عطاء اور ابوہریرہؓ کے تمام شاگردوں کی مخالفت کی ہے اور کئی روایات میں اس قسم کی مخالفت کی وجہ سے شعبہؓ نے اس کو ترک کر دیا ہے اور امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس سے حجت نہیں پکڑی یعنی اس کی روایت کو قابل استدلال نہیں سمجھا۔

جب عبدالملک کئی روایتوں میں مخالفت اور اغلاط کی وجہ سے محل اعتراض ہو گیا۔ اور اس کی روایت شاذ ہو گئی تو اب ابوہریرہ کا وہی فتویٰ درست رہا جو حدیث کے موافق ہے۔

ایک اور جواب

اور یہ بھی احتمال ہے کہ ابوہریرہ رضہ نے تین کا فتویٰ نہ دیا ہو بلکہ عملی غلطی کی ہو مگر دیکھنے والے نے ان کا مذہب سمجھ کر نقل کر دیا۔ اور ایسا اتفاق بہت دفعہ ہو جاتا ہے۔ دیکھئے مشکوٰۃ میں ہے کہ عمارؓ نے مدائن شہر میں امامت کرائی اور وہ ایک چبوترے پر کھڑے ہوئے اور لوگ نیچے تھے۔ حذیفہؓ نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا یہاں تک کہ عمار رضہ کو چبوترے سے نیچے اُتار دیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو حذیفہؓ نے فرمایا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا کہ امام کو مقتدیوں سے بلند جگہ پر نہ کھڑا ہونا چاہیئے۔ عمار نے فرمایا سنا ہے۔ اس لئے جب آپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو میں آپ کے پیچھے ہو لیا۔ یعنی نماز کی نیت باندھنے کے وقت مجھے خیال نہیں رہا۔ جب آپ نے ہاتھ کھینچا تو یاد آگیا۔ (مشکوٰۃ)

ہو سکتا ہے ابوہریرہؓ سے بھی اس طرح کی غلطی ہو گئی ہو۔ خاص کر جب عبدالملک کی روایت میں اختلاف ہے کبھی وہ قول نقل کرتا ہے اور کبھی فعل۔ چنانچہ بیہقی نے اپنی کتاب معرفہ میں لکھا ہے۔

وحدیثه هذا مختلف علیه فروی عنه من قول ابی هریرة وروی عنه من فعله (مغنی علی دار قطنی ص۲۵)

یعنی عبدالملک کے شاگرد مختلف ہیں۔ کوئی عبدالملک سے ابوھریرہ کا قول نقل کرتا ہے کوئی فعل۔

پس عبدالملک کی روایت کو اس صورت پر محمول کرنا مناسب ہے۔ جس سے وہ صحیح حدیث کے موافق ہو جائے۔ سو وہ صورت یہی ہے کہ روایت اصل میں ابو ہریرہؓ کا فعل ہے جو عمار بن یاسرؓ کی طرح علمی غلطی ہے

خلاصہ یہ کہ اول تو حدیث صحیح نہیں۔ دوم حدیث کے راوی ابو ہریرہ رضا اس کے خلاف ہیں۔ سوم رکعت یعنی رکوع لینا خلاف ظاہر ہے۔ مولوی عبدالجلیل صاحب نے ان جوابوں پر تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابو ہریرہ کی حدیث میں یحییٰ بن ابی سلیمان راوی ضعیف نہیں ثقہ ہے۔ ابن حبان۔ ذہبی۔ ابن خزیمہ۔ حاکم۔ ابو داؤد۔ منذری ان جلیل الشان محدثین کی بات کو محو کر دینا اہلِ تحقیق کی شان سے بعید ہے اس سے امام بخاری خلق افعال میں اور ابو داؤد۔ ترمذی۔ نسائی روایت کرتے ہیں۔ مولوی عبدالجلیل نے دوسرا اعتراض یہ کیا ہے کہ (محدث روپڑی) کا یہ فرمانا درست نہیں کہ سجدہ کا ذکر رکعت کے مقابلہ کے طور پر نہیں بلکہ موقع محل کے لحاظ سے ہے۔ اس لئے کہ اصولیین کا مقولہ ہے العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب۔ یعنی اعتبار عام لفظ کا ہے خاص سبب کا نہیں۔ امام بیہقی نے سنن میں مطالب عالیہ یحییٰ کی سند سے روایت کیا ہے۔ یعنی سفیان سے اخیر تک اس کے الفاظ یہ ہیں۔ اذا جئتم والامام راکع فارکعوا وان کان ساجدا فاسجدوا ولا تعتدوا بالسجود اذا لم یکن معہ الرکوع وفی روایۃ بالسجدۃ اذا لم تدرکوا الرکعۃ۔ یعنی جب تم نماز کو آؤ اور امام رکوع میں ہو تو رکوع کرو۔ اگر سجدہ میں ہو تو سجدہ کرو۔ اور سجدہ کو کچھ شمار نہ کرو جب تک اس کے ساتھ رکوع نہ ہو۔ اور ایک روایت میں ہے سجدہ کا اعتبار نہ کرو جب تک رکعت نہ پاؤ۔

اگر واقعی ایسا ہوتا جیسا آپ فرماتے ہیں تو ائمہ محدثینؒ مثل ابو داؤد۔ نسائیؒ وغیرہ اس حدیث سے استدلال پر جرأت نہ کرتے وغیرہ وغیرہ۔

جواب۔

محدث روپڑیؒ نے فرمایا کہ مولوی عبدالجلیل صاحب نے اس عبارت میں دو اعتراض کئے ہیں۔ ایک یہ کہ یحییٰ بن ابی سلیمان ضعیف نہیں ثقہ ہے۔ فلاں فلاں نے اس کو ثقہ کہا ہے اور اس کی حدیث حجت کے لائق ہے۔ دوسرا اعتراض یہ کہ عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کا واقعہ اگرچہ ایک خاص شخص کا ہے جو سجدہ میں آکر شامل ہوا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ہدایت فرمائی تھی مگر اعتبار عموم کا لفظ ہے۔ یہ حکم اوروں کو بھی شامل ہے۔ ایک شخص کے ساتھ خاص نہیں۔ پس جو شخص امام سے رکوع کی حالت میں ملے اس کی رکعت ہو جائے گی۔ اور فلاں فلاں محدث نے اس حدیث کا یہی مطلب سمجھا ہے۔ اور اِس لئے

انہوں نے رکوع کی رکعت ہونے پر اپنی اپنی کتاب میں باب باندھے ہیں۔

یہ مولوی عبدالجلیل کے دونوں اعتراضوں کا خلاصہ ہے لیکن مولوی عبدالجلیل نے پہلے اعتراض میں اُصول کی مخالفت کی ہے۔ اور دوسرا اعتراض کرتے وقت میری بات کو نہیں سمجھے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ محدثین کا اصول ہے کہ جرح تعدیل پر مقدم ہے۔ یحییٰ بن ابی سلیمان کو اگرچہ بعض نے ثقہ کہا ہے لیکن بیہقی نے اس کو ایک جگہ غیر قوی کہا ہے اور ایک جگہ ضعیف۔ اور امام بخاری ؒ نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے۔ امام بیہقی معرفہ میں لکھتے ہیں۔

تفرد به يحيى بن ابى سليمان وليس بالقوى (معنى على دارقطنی ص۱۳۲)

یعنی صرف یحییٰ بن ابی سلیمان اس حدیث کا راوی ہے اور وہ قوی نہیں۔

اور سنن کبریٰ میں امام بیہقی۔ ابوداؤد والی حدیث ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

وقد روى باسناد اضعف من ذالك عن ابى هريرة (سنن کبریٰ بیہقی جلد ۲ ص۸۹)

یعنی اس حدیث کی ایک اور سند بھی ہے جو یحییٰ بن ابی سلیمان سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔

نیز سنن کبریٰ میں لکھتے ہیں۔

قال ابواحمد وحدثنا الجنيدى حدثنا البخارى قال يحيى بن سليمان المدنى عن ابن المقبرى وابن ابى عتاب منكر الحديث قال الشيخ وقد روى باسناد مرسل۔ (سنن کبریٰ بیہقی جلد ۲ ص۸۹)

یعنی امام بخاریؒ کہتے ہیں یحییٰ بن ابی سلیمان مدنی جو ابن مقبری اور ابن ابی عتاب سے روایت کرتا ہے منکر الحدیث ہے۔ یعنی باوجود ضعیف ہونے کے ثقوں کی مخالفت کرتا ہے۔

امام بخاریؒ نے یحییٰ بن ابی سلیمان پر جرح مفسر کی ہے پس بقاعدہ اصول یہ جرح دوسرے علماء کی تعدیل پر مقدم ہوگی پھر تعدیل کرنے والوں سے امام ذہبیؒ کہتے ہیں کہ ہمیں اس میں کوئی جرح معلوم نہیں ہوتی۔

لہ اس سند میں یحییٰ بن حمید ہے جو قرہ بن عبدالرحمٰن کا شاگرد ہے یہ مجہول ہے اس پر اعتماد نہیں۔ امام بخاری نے کہا اس کی متابعت نہیں کی جاتی اور دارقطنی نے اس کو ضعیف کہا (جزء القراۃ) اور قرہ بن عبدالرحمٰن پر بھی بہت جرح ہے امام احمدؒ نے اس کو سخت منکر الحدیث کہا ہے اور یحییٰ نے ضعیف الحدیث اور ابوحاتم نے لیس بقوی کہا ہے۔

چنانچہ ذہبی کی بعض عبارتوں میں اس کی تصریح ہے۔ اپنی مختصر میں مستدرک حاکم پر ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ثقۃ (جلد اول صفحہ) یعنی یحییٰ ثقہ ہے۔ اور ایک جگہ لکھتے ہیں لم یذکر بجرح (جلد اول صفحہ ۲۷) یعنی جرح کے ساتھ ذکر نہیں کیا گیا۔ اور اسی بنا پر ابن خزیمہؒ نے اس کی روایت کی ہے کیونکہ ان کو بھی اس میں جرح معلوم نہیں ہوئی اور ابن حبان کا ثقات میں شمار کرنا بھی اسی بنا پر ہے۔ کیونکہ ابن حبان رحمہ کا تساہل مشہور ہے یعنی ذرا سے سہارے پر ثقوں میں شمار کر لیتے ہیں۔ ابوداؤد اور منذری کا سکوت بھی اسی بنا پر ہو سکتا ہے پس جس شخص کو کوئی جرح معلوم نہیں ہوتی وہ اس سے بے علم رہا۔ اور دوسرے کو علم ہو گیا۔ پس علم والے کی بات مقدم ہو گی۔ پھر جزءالقراۃ میں امام بخاریؒ نے اس حدیث کے ضعف کی وجہ اور تبلائی ہے وہ یہ کہ یحییٰ بن ابی سلیمان کا سماع اپنے اُستاد زید اور ابن المقبری سے معلوم نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ویحییٰ ھذا منکر الحدیث روی عنہ ابوسعید مولیٰ بنی ھاشم وعبد اللہ بن رجاء البصری مناکیر ولم یتبین سماعہ من زید ولامن ابن المقبری ولا یقوم بہ الحجۃ۔

یعنی یحییٰ منکر الحدیث ہے۔ اس سے ابوسعید مولا بنی ہاشم اور عبداللہ بن رجاء بصری نے منکر حدیثیں روایت کی ہیں۔ اور اس کا سماع زید سے اور ابن مقبری سے (جو اس حدیث میں اس کے استاد ہیں) معلوم نہیں۔ اور اس کی حدیث سے اس کی حجت قائم نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ کہ حدیث ضعیف ہے۔ استدلال کے لائق نہیں۔ خاص کر فاتحہ جیسے زبردست مسئلہ کے مقابلہ میں جس کی فرضیت کالشمس فی نصف النہار تک ہے بھلا اس کی فرضیت ایسی ضعیف حدیث سے کس طرح رفع ہو سکتی ہے؟

دوسرے اعتراض کا جواب

اب مولوی عبدالجلیل کے دوسرے اعتراض کا حال سُنئے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ حکم اس شخص کے ساتھ خاص ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی ہے بلکہ میں کہتا ہوں قیامت تک سب کو شامل ہے مگر اس حدیث میں رکوع میں رکعت ہونے کا ثبوت نہیں۔ بلکہ رکعت سے مراد رکعت ہی ہے اور مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ جس نے رکعت پائی۔ اس نے نماز پائی۔ کیونکہ ادنیٰ درجہ نماز ایک رکعت ہے جس نے رکعت سے کم حصہ پایا۔ مثلاً رکوع میں شریک ہوا۔ اس نے نماز نہیں پائی۔ وہ یہ رکعت نئے سرے

سے شبہ چونکہ شبہ ہوتا تھا کہ اس حدیث میں رکعت سے مراد رکوع ہے کیونکہ سجدہ کے مقابلہ میں جب رکعت آئے تو اس سے رکوع ہی مراد ہوتا ہے۔ تو اس شبہ کا جواب میں نے یہ دیا کہ اس حدیث میں سجدہ کا ذکر مقابلہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک شخص سجدہ میں آکر شامل ہوا تو اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کا ذکر کرکے فرما دیا کہ سجدہ کو کچھ شمار نہ کرنا۔ اور ایسا بہت ہوتا ہے موقعہ کے لحاظ سے ایک لفظ بول دیا جاتا ہے اور حکم اس کے ساتھ خاص نہیں ہوتا۔ مثلاً قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ جمعہ کی آیت میں فرماتا ہے وذروا البیع یعنی خرید و فروخت چھوڑ کر جمعہ کو آؤ۔ حالانکہ یہ حکم خرید و فروخت والوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ دوسرے کاروبار والوں کو بھی شامل ہے مگر چونکہ اس کے بعد دوسری آیت کے نزول کے واقعہ میں تجارت کا سلسلہ تھا چنانچہ اس کے بعد کی آیت میں تجارت کی تصریح ہے اس لئے بیع کے چھوڑنے کا ذکر کر دیا۔ ٹھیک اسی طرح حدیث مذکور میں سجدہ کا ذکر کر دیا یہ مطلب نہیں کہ سجدہ میں رکعت نہیں ہوتی اور رکوع میں ہو جاتی ہے بلکہ رکوع میں بھی نہیں ہوتی۔ جب تک پوری رکعت نہ پائے اس وقت تک اس کو نماز کا پانے والا نہیں کہہ سکتے۔

مولوی عبدالجلیل کو خدا جانے کیا ہوا بغیر سمجھے دوسرے پر اعتراض کئے جاتے ہیں۔

رہا بعض محدثین کا اس حدیث پر باب باندھنا تو یہ الگ چیز ہے باب کبھی ضعیف اور محتمل حدیث پر بھی باندھا جاتا ہے اور کبھی دو باب مختلف بھی باندھے جاتے ہیں۔ چنانچہ حدیث کے پڑھنے پڑھانے والوں پر مخفی نہیں۔ مثال کے لئے نسائی میں قرأۃ خلف الامام کے ابواب اور ابوداؤد میں استحاضہ کے ابواب ملاحظہ ہوں۔

اس کے علاوہ راوی حدیث ابوہریرہ رض کا فہم محدثین کے فہم پر مقدم ہے۔ ابوہریرہ رض نے اس حدیث کا یہ مطلب نہیں سمجھا کہ رکوع میں رکعت ہو جاتی ہے بلکہ وہ رکوع میں رکعت کے قائل نہیں۔ ملاحظہ ہو

(جزء القرأۃ امام بخاری)

پس ابوہریرہؓ کے موافق اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ رکعت سے مراد رکوع نہیں بلکہ رکعت سے مراد رکعت ہی ہے۔ اور اصل بھی یہی ہے۔

عون المعبود میں ہے۔

قیل المراد به ههنا الركوع فيكون مدرك الامام راكعا مدركا لتلك الركعة وفيه نظر لان الركعة حقيقة لجميعها واطلاقها على

الركوع ومابعده مجازا وايضا راليه الالقرينة كما وقع عند مسلم من حديث البراء بلفظ فوجدت قيامه فركعته فاعتداله فسجدته فان وقوع الركعة فى مقابلة القيام والاعتدال والسجود قرينة تدل على ان المراد بها الركوع وههنا ليست قرينة تصرف عن حقيقة الركعة فليس فيه دليل على ان مدرك الامام راكعا مدرك لتلك الركعة ۔ (عون المعبود جلد اول ص۳۳۳)

یعنی کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں رکعت سے مراد رکوع ہے پس جو امام کو رکوع میں پائے اس کی رکعت ہو جائے گی مگر یہ کہنا ٹھیک نہیں کیونکہ رکعت کا حقیقی معنی پوری رکعت ہے اور رکوع وغیرہ پر اس کا اطلاق مجازی ہے جس کے لئے قرینہ کی ضرورت ہے جیسے مسلم میں براء کی حدیث میں رکعت سے رکوع مراد ہے کیونکہ قیام اعتدال اور سجدہ کے مقابلہ میں واقع ہونا اس بات کا قرینہ ہے اور اس حدیث میں کوئی قرینہ نہیں پس رکعت سے رکوع مراد لے کر یہ ثابت کرنا کہ رکوع میں رکعت ہو جاتی ہے یہ صحیح نہ ہوا ۔

مولوی انور شاہ دیوبندی نے فصل الخطاب میں عبد العزیز بن رفیع والی حدیث کو مطالب عالیہ سے نقل کیا ہے ۔ اور کہا ہے کہ میں نے اس حدیث کو مطالب عالیہ سے اس لئے نقل کیا ہے کہ حافظ نے مطالب عالیہ میں اس کو صحیح کہا ہے اور بیہقی کا معرفہ میں اس کو مرسل کہنا اس سے مراد یہ ہے کہ صحابی کا نام نہیں لیا گیا ۔ سنن بیہقی میں اس کو ان الفاظ سے بھی ذکر کیا ہے ۔

شعبة ثنا عبد العزيز بن محمد المكى عن رجل عن النبى صلى الله عليه وسلم قال من لم يدرك الركعة لم يدرك الصلوٰة (سنن کبریٰ بیہقی جلد ۲ ص۸۹)

یعنی عبد العزیز (بن رفیع) بن محمد ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے رکعت نہیں پائی اس نے نماز نہیں پائی ۔

جواب

مولوی انور شاہ کا بیہقی کے کلام میں مرسل سے یہ مراد لینا کہ اس کے صحابی کا نام نہیں لیا گیا ۔ یہ مرسل کا معنی نہیں ۔ مرسل کا یہ معنی ہے کہ تابعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرے اور صحابی کا ذکر چھوڑ دے اور ایسی روایت ضعیف ہوتی ہے پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ شیخ انصاری صحابی ہے یا نہیں ۔ اور حافظ کا مطالب عالیہ میں اس کو صحیح کہنا اس سے مراد صحابی کے علاوہ باقی سند کی صحت ہے ۔

جواب ۲

مولوی عبدالجلیل صاحب نے بیہقی سے اس کی دو سندیں ذکر کی ہیں، مگر ایک راوی محمد بن بالویہ اور ابوطاہر فقیہ کی ثقاہت بیان نہیں کی۔

جواب ۳

رکعت کے حقیقی معنی پوری رکعت ہے اس سے رکوع مراد لینا تاویل ہے۔

جواب ۴

بیہقی کی جس روایت میں رکوع کی تصریح ہے اس کی صحت معلوم نہیں، نیز روایت بالمعنی کا بھی احتمال ہے، یعنی کسی راوی نے رکعت کو رکوع کے معنی میں سمجھ کر رکوع کا لفظ بول دیا۔ نیز یہ حدیث ابوہریرہ سے بھی مروی ہے۔ اور ابوہریرہ رکوع میں رکعت کے قائل نہیں اس لئے رکعت بمعنی رکوع لینا ٹھیک نہیں۔

تعاقب ۱

مولوی عبدالجلیل نے محدث روپڑی کے مضمون بالا پر تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

آپ کا یہ فرمانا ٹھیک نہیں کہ دو سندوں میں ایک ایک راوی چھوڑ دیا ہے اس کی توثیق نہیں کی، حالانکہ یہ دونوں بیہقی کے اُستاد ہیں۔ یہ دونوں ہی ثقہ ہیں۔ محمد بن احمد بن بالویہ کو خطیب نے ثقہ کہا ہے۔ تاریخ بغداد ص۲۲۳ جلد ۱۔ اور ابوطاہر فقیہ محمد بن محمد بن محمش الفقیہ مشہور ثقات سے ہیں، اِس لئے ان کی توثیق ذکر نہیں کی تھی۔ دونوں سندیں بلکہ مطالبہ عالیہ کے ساتھ تینوں سندیں صحیح ہیں۔

تعاقب ۲

آپ نے لکھا ہے کہ صرف صحابی کا نام نہ ذکر ہونے سے مرسل کہنا ٹھیک نہیں، یہ بھی درست نہیں۔ واقعی جمہور محدثین اسے مرسل نہیں کہتے مگر یہ اصطلاح خاص خاص لوگوں کی ہے۔ ولا مشاحة فی الاصطلاح جیسے امام بیہقیؒ اپنی سنن اور امام الحرمین وغیرہما چند معدود اہلِ علم ملاحظہ ہوں۔ "تدریب الراوی ص۱۲۶"۔

واما اذا قال الراوی فی الاسناد فلان عن رجل او شیخ عن فلان فقال الحاکم هو منقطع لیس مرسلا وقال غیرہ مرسل الی ان قال فجعل رای البیہقی فی سننه ما رواہ التابعی عن رجل من الصحابة لم یسم مرسلا الفیہ عراقی مع شرح فتح الباقی میں ہے۔

ویسموا منقطعا عن رجل وفی الاصول نعتد بالموسل ووقع فی کلام البیھقی تسمیتہ ایضا مرسلا ومرادہ مجرد التسمیۃ ۔ نہایت السول شرح منہاج الاصول۔ بیضاوی میں فاضل اسنوی فرماتے ہیں صنگ ج ۲۔

قول الراوی اخبرنی اوعدل موثوق بہ من الموسل ایضا

راوی تابعی صحابی کا ذکر نہ کرے اور صرف عن رجل یا عن شیخ وغیرہ کہے تو وہ امام بیہقی کے نزدیک مرسل کہلاتی ہے۔ دیگر اسے منقطع کہتے ہیں۔ صحابی کے علاوہ۔ ہاں تابعی صحابی کا ذکر نہ کرے۔ اور عن رجل کہے تو وہ صحابی کے نزدیک مرفوع اور حجت ہوتی ہے۔

تعاقب ۳

آپ نے لکھا ہے کہ رکعت کو بمعنی رکوع لینا تاویل ہے" یہ بھی ٹھیک نہیں۔ اس لئے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں رکعت بمعنی رکوع وارد ہے۔ پھر اسے تاویل کہنا اہل علم کی شان سے بعید ہے۔

تعاقب ۴

آپ نے لکھا ہے جس روایت میں رکوع کی تصریح ہے اس کی صحت معلوم نہیں حالانکہ میں ذکر کر چکا ہوں کہ صرف امام بیہقی کے اُستادوں کا ذکر باقی تھا وہ اب معلوم ہو گیا۔ سند وہی ہے جو مطالب عالیہ کی ہے سفیان سے اور اس سے قبل کے راوی سب کے سب ثقہ رجال بخاری اور مسلم وغیرہ سے ہیں۔ واللہ الموفق

تعاقب ۵

آپ نے لکھا ہے کہ اس میں روایت بالمعنیٰ کا احتمال ہے" میں کہتا ہوں کہ احادیث میں روایت بالمعنیٰ کو دخل ہے مگر یہ کیونکر ہو کہ اس جگہ بالمعنیٰ ہی قطعاً ہے۔ احتمال سے تو کوئی روایت خالی نہیں۔ اس لئے آئمہ لغت احادیث کے کلمات سے استدلال نہیں پکڑتے بلکہ دونوں لفظ ایک ہی معنیٰ میں ان کے نزدیک ہیں دونوں میں تنافی نہیں۔

تعاقب ۶

آپ نے بیان فرمایا ہے کہ" ابو ہریرہ رضہ اس کے خلاف ہیں" میں کہتا ہوں کہ ابو ہریرہ رضہ مخالف بھی ہیں۔ اور موافق بھی بلکہ موافق کی روایت تو اصح الکتب موطاء امام مالک کی ہے اور وہ یہ ہے۔

ان اباھریرۃ کان یقول من ادرک رکعۃ فقد ادرک السجدۃ ومن فاتہ

ام القرآن فقد فاته خير كثير۔

بے شک ابوہریرہ رضہ کہتے تھے جس نے رکعت پائی اس نے سجدہ پایا اور جس سے ام القرآن فوت ہوگئی اُس سے خیر کثیر فوت ہوگئی۔

لہٰذا یہ کہنا کہ ابوہریرہ رضہ راوی حدیث کی بنا پر رکعت یعنی رکوع صحیح نہیں قابل سماع نہیں۔ دوسرا یہ کہہ سکتا ہے کہ ابوہریرہ کی اس روایت کی بنا پر صحیح ہے رکعت یعنی رکوع بلکہ مرفوع کے موافق کو ترجیح ہونی چاہیے۔ کمالا یخفیٰ اس موطا کی روایت سے آپ کا بار بار یہ کہنا کہ راوی حدیث کا فتویٰ اس کے خلاف ہے ٹھیک نہ ہوا بلکہ راوی حدیث کا فتویٰ حدیث کے موافق ہے۔ حدیث کی تائید ہوتی مگر ہمیں تو اس کی ضرورت نہیں۔ راوی حدیث خواہ خلاف ہی کرے، حدیث میں اس سے خامی نہیں آسکتی۔ مسئلہ صاف ہے قائلین مدرک رکوع مدرک رکعت پر کوئی عار و شنار نہیں، گو ایک جماعت نے عدم کو بھی استعمال کیا ہے مگر جمہور اس کے قائلین میں سے ہیں۔ لہٰذا تشدد اور ایک دوسرے کی تضلیل و تکفیر سے احتراز لازم ہے۔

جواب تعاقب اوّل

مطلوبہ راویوں کی ثقاہت تو آپ نے بیان کردی لیکن یہ کہنا کہ دونوں سندیں بلکہ مطالب عالیہ کے ساتھ تینوں سندیں صحیح ہیں یہ صحیح نہیں جس کی وجہ آگے بیان ہوتی ہے۔

جواب تعاقب دوم

بیہقی نے عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کو موصول کے مقابلہ میں مرسل کہا ہے۔

چنانچہ معرفۃ السنن میں لکھتے ہیں:۔

وقد روى ادراك الركعة بادراك الركوع فى خبر مرسل عن النبى صلى الله عليه وسلم وفى خبر موصول عنه غير قوى اما المرسل فرواه عبد العزيز بن رفيع عن رجل عن النبى صلى الله عليه وسلم انتهى ملخصا۔

یعنی رکوع میں رکعت کا ہونا مرسل حدیث میں بھی آیا ہے۔ مرسل کو عبدالعزیز بن رفیع نے ایک شخص سے اُس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

اس عبارت میں عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کو موصول کے مقابلہ میں مرسل کہا ہے اور ظاہر ہے کہ موصول وہ ہے جس میں کوئی راوی گرا ہوا نہ ہو تو گویا عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث میں کوئی راوی گرا ہوا ہے

اب اس کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ عبد العزیز بن رفیع کا اُستاد شخص مجہول بیہقی کے نزدیک صحابی نہ ہو۔ اور ابن ابی شیبہ کی روایت[1] سے اس کا صحابی ہونا معلوم ہوتا ہے وہ بیہقی کو معلوم نہ ہو یا صحت کو نہ پہنچی ہو۔ دوسری صورت یہ کہ بیہقی کے نزدیک یہ شخص صحابی ہو لیکن صحابی کا مجہول ہونا ان کے نزدیک صحت حدیث کو مانع ہو۔ اس لئے انہوں نے اس کی حدیث کو کالعدم قرار دے کر حدیث پر مرسل ہونے کا حکم لگادیا۔ تیسری صورت یہ کہ عبد العزیز بن رفیع نے مجہول صحابی سے عن کے ساتھ عن سے روایت کی ہے اور جب تابعی مجہول صحابی سے عن کے ساتھ روایت کرے وہ روایت صحیح نہیں ہوتی تو گویا صحابی کا ذکر کالعدم ہوگیا۔ اس لئے روایت مرسل ہوگئی۔

تدریب الراوی میں ہے۔

وَاِذَا قَالَ الرَّاوِیُ فِی الْاِسْنَادِ (فُلَانٌ عَنْ رَجُلٍ) اَوْ شَیْخٌ (عَنْ فُلَانٍ فقال الحاکم) هُوَ مُنْقَطِعٌ لَیْسَ مُرْسَلًا وَقَالَ غَیْرُهٗ) حَکَاهُ ابْنُ الصَّلَاحِ عَنْ بَعْضِ کُتُبِ الْاُصُوْلِ (مُرْسَلٌ) قَالَ الْعِرَاقِیُّ وَکُلٌّ مِنَ الْقَوْلَیْنِ خِلَافُ مَا عَلَیْهِ الْاَکْثَرُوْنَ بِاَنَّهُمْ ذَهَبُوْا اِلٰی اَنَّهٗ مُتَّصِلٌ فِیْ سَنَدِ مَجْهُوْلٍ حَکَاهُ الرَّشِیْدُ الْعَطَّارُ وَاخْتَارَهُ الْعَلَائِیُّ قَالَ وَمَا حَکَاهُ ابْنُ الصَّلَاحِ عَنْ بَعْضِ کُتُبِ الاصول اراد به البرهان لامام الحرمین فانه ذکر ذالک فیه وزاد کتب النبی صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَّتِیْ لَمْ یُسَمَّ حَامِلُهَا وَزَادَ فِی الْمَحْصُوْلِ مَنْ سُمِّیَ بِاسْمٍ لَا یُعْرَفُ قَالَ وَعَلٰی ذَالِکَ مَشٰی اَبُوْ دَاؤُدَ فِیْ کِتَابِ الْمَرَاسِیْلِ فَاِنَّهٗ یَرْوِیْ فِیْهِ مَا اُبْهِمَ فِیْهِ الرَّجُلُ قَالَ بَلْ زَادَ الْبَیْهَقِیُّ عَلٰی هٰذَا فِیْ سُنَنِهٖ فَجَعَلَ مَا رَوَاهُ التَّابِعِیُّ عَنْ

---

[1] روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ عن عبد العزیز بن رفیع عن رجل من اهل المدینة عن النبی صلی الله علیه وسلم انه سمع خفق نعلی وهو ساجد فلما فرغ من صلوته قال من هذا الذی سمعت خفق نعله فقال انا یا رسول الله قال فما قال وجدتک ساجدا فسجدت فقال هکذا ولا تعتدوا بها من وجدنی راکعا او قائما او ساجدا فلیکن معی علی حالتی التی انا علیها۔

(عون المعبود جلد اول ص۳۳۵)

رَجُلٍ مِنَ الصَّحَابَةِ لَمْ يُسَمَّ مُرْسَلاً وَلَيْسَ بِجَيِّدٍ اَللّٰهُمَّ اِلَّا اِنْ كَانَ يُسَمِّيْهِ مُرْسَلاً وَيَجْعَلُهُ حُجَّةً كَمَرَاسِيْلِ الصَّحَابَةِ فَهُوَ قَرِيْبٌ وَقَدْ رَوَى الْبُخَارِيُّ عَنِ الْحُمَيْدِيِّ قَالَ اِذَا صَحَّ الاسناد عن الثقات الى رجل من الصحابة فَهُوَ حُجَّةٌ وَاِنْ لَمْ يُسَمَّ ذَالِكَ الرجل قال الاثرم قُلْتُ لِاَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلٍ اِذَا قَالَ رَجُلٌ مِنَ التَّابِعِيْنَ حَدَّثَنِيْ رَجُلٌ مِنَ الصَّحَابَةِ وَلَمْ يُسَمِّهِ فَالْحَدِيْثُ صَحِيْحٌ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَفَرَّقَ الصيرفي مِنَ الشَّافِعِيَّةِ بَيْنَ اَنْ يَرْوِيَهُ التَّابِعِيُّ مِنَ الصَّحَابِيِّ مُعَنْعَنًا اَوْ مُصَرِّحًا بِالسَّمَاعِ قَالَ وَهُوَ حَسَنٌ مُتَّجِهٌ وَكَلَامُ مَنْ اَطْلَقَ قُبُوْلَهُ مَحْمُوْلٌ عَلٰى هٰذَا التَّفْصِيْلِ الخ

(تدریب الراوی ص۱۲۳)

یعنی جب راوی اسناد میں رَجُلٌ کا لفظ بولے یا شَیْخٌ کا لفظ بولے اور نام نہ لے تو حاکم کہتے ہیں یہ اسناد منقطع ہے۔ مرسل نہیں اور حاکم کے علاوہ اور کہتے ہیں کہ یہ مرسل ہے۔ چنانچہ ابن الصلاح نے بعض کتب اصول سے یہ نقل کیا ہے۔ عراقی کہتے ہیں یہ دونوں قول یعنی حاکم کا قول اور غیر حاکم کا قول اکثر کے خلاف ہے کیونکہ اکثر کہتے ہیں یہ اسناد متصل مجہول ہے۔ رشید عطار نے اس کا ذکر کیا ہے اور علائی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور ابن الصلاح نے بعض کتب الاصول سے جو کچھ نقل کیا ہے اس سے مراد امام الحرمین کی کتاب برہان ہے۔ اس میں امام الحرمین نے ایسی روایت کا مرسل ہونا ذکر کیا ہے۔ جس میں راوی رجل یا شیخ کا لفظ بولے۔ اور امام الحرمین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خط و کتابت جس کے پہنچانے والے کا نام نہیں لیا گیا۔ اس کو بھی اسی (مرسل) میں شمار کیا ہے۔ اور امام رازی نے محصول میں اس شخص کی روایت کو بھی اسی میں داخل کیا ہے جو غیر مشہور نام کے ساتھ ذکر ہو جس سے پتہ نہ لگے کہ یہ کون ہے اور کہا ہے کہ امام ابوداؤد نے کتاب مراسیل میں بھی یہ روش اختیار کی ہے۔ کیونکہ وہ اس میں ایسی روایتیں بھی لائے ہیں جن کے راوی مبہم نام کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں۔ نیز امام رازی نے کہا ہے کہ امام بیہقی نے اپنی سنن میں اس روایت کو بھی مرسل میں شمار کیا ہے جس میں "تابعی عن رَجُلٍ مِنَ الصَّحَابَةِ" کہے اور صحابی کا نام نہ لے لیکن امام بیہقی کا اس کو مرسل کہنا ٹھیک نہیں کیونکہ یہ حجت ہے، ہاں اگر صرف نام مرسل رکھے اور اس کو حجت سمجھے جیسے مراسیل صحابہ (باوجود مرسل ہونے کے) حجت

ہیں تو پھر یہ خیال تو بہت قریب درست ہے۔ اور امام بخاریؒ نے امام حمیدی سے نقل کیا ہے کہ جب صحابی تک سند صحیح ہو اور صحابی کا نام نہ لیا جائے تو یہ روایت ثبت ہے۔ اور امام اثرم کہتے ہیں۔ میں نے امام احمد بن حنبل سے سوال کیا ہے کہ جب تابعی کہے کہ مجھے ایک شخص صحابی نے حدیث سنائی اور صحابی کا نام نہ لے تو کیا یہ حدیث صحیح ہوگئی؟ امام احمد نے کہا ہاں۔ امام رازی نے یہ بھی کہا ہے کہ امام صیرفی نے اس میں کچھ تفصیل کی ہے۔ وہ یہ کہ تابعی ایسے مجہول صحابی سے عن کے ساتھ روایت کرے تو اس کا حکم اور ہے اور اگر سماع کی تصریح کرے تو اس کا حکم اور ہے۔ یعنی دوسری صحیح ہے۔ پہلی صحیح نہیں۔ اور جس امام نے تصریح سماع کی شرط نہیں کی اس کا قول بھی اسی تفصیل پر محمول ہے۔ یعنی سماع کی تصریح ہو تو صحیح ہے ورنہ نہیں "

تدریب الراوی کی اس عبارت نے معاملہ بالکل صاف کر دیا۔ اور بتلا دیا کہ عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث صحیح نہیں کیونکہ عبدالعزیز نے سماع کی تصریح نہیں کی بلکہ عن کے ساتھ روایت کی ہے۔

مولوی عبدالجلیل صاحب پر بڑا تعجب ہے کہ تدریب الراوی کے صفحہ ۱۳۳ سے عبارت نقل کرتے وقت اخیر کے حصے کو چھوڑ دیا حالانکہ یہی حصہ عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کے لئے فیصلہ کن ہے اور اسی سے امام بیہقی کے مرسل کہنے کی ایک صحیح وجہ معلوم ہو سکتی ہے۔ مولوی عبدالجلیل صاحب! اب تو آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ میرا تعاقب مولوی انور شاہ صاحب پر بالکل درست ہے۔ اور میں بفضلِ خدا حق کے ساتھ ہوں۔ اور اس سے عداوت نہیں رکھتا۔ ہاں اب آپ پر آزمائش کا وقت آیا ہے دیکھئے آپ اپنی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے رجوع الی الحق کرتے ہیں یا نہیں۔ واللہ الموفق

نوٹ:۔

جب عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث صحیح نہ ہوئی تو ابن حافظ - کا مطالب عالیہ میں اس کو صحیح کہنا اس سے مراد مرسل صحیح ہوگی۔ یعنی صحابی کے علاوہ باقی سند صحیح ہے۔

جواب تعاقب نمبر ۴

رکعت کے حقیقی معنی پوری رکعت کے ہیں۔ شارح کے کلام میں بے شک رکعت کا معنی رکوع آیا ہے لیکن قرینہ کے ساتھ۔ اور یہاں کوئی قرینہ نہیں اس لئے رکعت بمعنی رکوع لینا تاویل ہے۔ چنانچہ پرچہ تنظیم اہلحدیث مورخہ ۲ ذی الحجہ ۱۳۷۵ھ صفحہ کالم ۳ میں اس کی تفصیل ہو چکی ہے۔

جواب تعاقب نمبر ۴

عبدالعزیز بن رفیع کی بعض روایات میں آپ کے رکوع کا لفظ ذکر نہیں کیا۔ سو جب وہ حدیث ہی صحیح نہ ہوئی تو بعض روایات کا کیا اعتبار؟۔

جواب تعاقب نمبر ۵

آپ کو شاید معلوم نہیں اِذَا جَاءَ الْاِحْتِمَالُ بَطَلَ الْاِسْتِدْلَالُ۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ قواعد سے واقف نہیں۔ مدعی کے ذمے ثبوت ہوتا ہے۔ اگر اس کے ثبوت میں کوئی خلاف احتمال آجائے تو ثبوت ردی ہو جاتا ہے۔ آپ اس بات کے مدعی ہیں کہ باوجود فرضیت فاتحہ کے رکوع میں رکعت ہو جاتی ہے۔ سو آپ کو کوئی زبردست ثبوت دینا چاہیئے۔ یہ حدیث باوجود ضعیف ہونے کے اس میں روایت بالمعنی کا قوی احتمال ہے کہ شاید راوی نے رکعت بمعنی رکوع سمجھ کر رکوع کا لفظ بول دیا ہو۔ اب اس کے مقابلے میں آپ کا یہ کہنا کہ یہ کیونکر ہوا اور کیا اس جگہ بالمعنیٰ ہی ہے۔ قطعاً ہے یہ کس قدر دُور از عقل ہے۔ کیا قطعی بات ہی دلیل کو توڑا کرتی ہے۔ احتمال اور شک سے دلیل ردی نہیں ہوتی۔ پھر اس کے بعد یہ کہنا کہ احتمال سے تو کوئی روایت خالی نہیں۔ یہ کیسے بے محل ہے؟ کیا صرف احتمال ہونے سے یہ لازم آجاتا ہے کہ خلاف احتمال ہو نفس احتمال اور شے ہے۔ خلافِ احتمال اور شے ہے۔ اس حدیث کی تمام روایتوں میں رکعت کا لفظ ہے صرف ایک روایت میں رکوع کا لفظ ہے۔ اب بتلایئے۔ بہت کی رعایت چاہیئے یا ایک کی۔ آپ کہتے ہیں سب روایتوں کو رکوع کی روایت کے تابع کر کے رکعت بمعنی رکوع لو۔ ہم کہتے ہیں رکوع کو روایت بالمعنی قرار دیکر رکعت کو اپنے معنی پر رکھو تاکہ زیادہ کی رعایت ہو۔ نیز ابُوہریرہؓ بھی اس حدیث کے راوی ہیں۔ ان کی موافقت ہو۔ نیز فرضیت فاتحہ کا مسئلہ ہمارا موید ہے۔ نیز یہ حدیث خاص کر رکوع والی حدیث صحیح سند سے مروی نہیں ان سب کو مدنظر رکھتے ہوئے انصاف سے کہیں کہ ترجیح کس جانب کو ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ درجہ کی صحیح سند جو متفق علیہ اس کے ساتھ اس حدیث کے الفاظ یُوں آئے ہیں۔

مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلٰوةِ مَعَ الْاِمَامِ فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلٰوةَ۔

یعنی جو شخص امام کے ساتھ رکعت پائے اس نے نماز پائی۔ (مشکوٰۃ باب الخطبہ والصلوٰۃ)

پس جو روایت الفاظ میں اس کے موافق ہوگی۔ اسی کے الفاظ اصل روایت سمجھی جائے گی۔ سو اب ہم دیکھتے ہیں کہ عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث کے کون سے الفاظ اس کے موافق ہیں؟ ظاہر ہے کہ وہی الفاظ موافق

ہیں جو مطالب العالیہ کی روایت کے بعد بحوالہ سُنن کبریٰ بیہقی سے ہم نقل کر چکے ہیں۔

مَنْ لَمْ يُدْرِكِ الرَّكْعَةَ لَمْ يُدْرِكِ الصَّلٰوةَ۔

جس نے رکعت نہیں پائی اُس نے نماز نہیں پائی۔

جب یہ الفاظ اعلیٰ درجہ کی صحیح روایت کے موافق ہوئے تو اب ضروری ہوا کہ ان الفاظ کو اصل سمجھا جائے اور رکوع وغیرہ کے لفظ کو اس کے تابع کر کے کہا جائے کہ کسی راوی نے رکعت بمعنی رکوع سمجھ کر رکوع کہہ دیا یا یہ کہ رکعت والی روایت کو رکوع کے معنی میں لے کر رکوع والی روایت کے تابع کیا جائے کیونکہ ضعیف کی تاویل معمولی بات ہے۔ یہ صحیح کو حتی الوسع ظاہر سے نہیں پھیرا جاتا۔ اب بھی اگر آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو پھر خلوص سے دعا کریں کہ خدا آپ کو شرح صدر عطا فرمائے۔ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ۔

جواب تعاقب نمبر ۶

مؤطا کی روایت جو آپ نے ذکر کی ہے اُس کی سند یہ ہے۔

عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَقُولُ مَنْ أَدْرَكَ الرَّكْعَةَ۔ الخ

یعنی امام مالک کو یہ پہنچا ہے کہ ابو ہریرہ رضہ کہتے تھے جو رکعت پائے اُس نے نماز پائی

امام مالک ابو ہریرہ رضہ کو نہیں ملے بلکہ اُن میں اور ابو ہریرہ رضہ میں کئی واسطے ہیں۔ اسی واسطے کہا کہ امام مالک کو ابو ہریرہ رضہ کی یہ بات پہنچی ہے۔ اب مولوی عبدالجلیل کا یہ کہنا کہ یہ روایت اصح الکتب کی ہے۔ یہ کتنا بڑا مغالطہ ہے۔ مؤطا کو بعض نے بے شک اصح الکتب کہا ہے لیکن ان روایتوں کے لئے جو اُس میں پوری سند کے ساتھ ذکر ہیں نہ اُن کے لئے جن کی سند ہی مذکور نہیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض کی تو صحت ہی مشکل ہو جاتی ہے چہ جائیکہ اُن کو اعلیٰ درجہ کی صحیح شمار کیا جائے۔ مثلاً بخاری اصح الکتب ہے لیکن تعلیقات بخاری (جن کی سند بالکل یا پوری ذکر نہیں ہوتی) ان میں کئی محل گفتگو بھی ہیں۔ چہ جائیکہ ان کو اعلیٰ درجہ صحت کا دیا جائے۔

مولوی عبدالجلیل صاحب ایسا مغالطہ آپ کے لائق نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس میں بھی رکعت کا لفظ ہے جو اپنے معنی پر ہے۔ رکعت کو رکوع کے معنی میں لینے پر کوئی دلیل نہیں۔ ہاں سجدہ اس میں نماز کے معنی میں ہے دلیل اس پر اُوپر کی روایت ہے جو بحوالہ مشکوٰۃ اس سے پہلے بھی گزری ہے۔ یعنی مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلٰوةِ مَعَ الْإِمَامِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلٰوةَ۔ پس جب سجدہ سے مراد نماز ہوئی اور رکعت اپنے معنی پر رہی تو ابو ہریرہ کا فتوےٰ رکوع میں رکعت کا نہ ہوا۔

اور ایک صورت میں سجدہ اپنے معنیٰ پر بھی رہ سکتا ہے۔ وہ یہ کہ سجدہ پانے سے یہ مراد ہے کہ سجدہ معتبر ہوگا اور شمار میں آئے گا۔ یعنی جو شخص رکعت پالے۔ اور جس سے بوجہ فاتحہ وغیرہ فوت کے رکعت فوت ہوگئی۔ اس کا سجدہ کسی گنتی میں نہیں۔ اس صورت میں بھی ابوہریرہ کا فتویٰ رکوع میں رکعت کا نہ ہوا۔ اور سب الفاظ بھی اپنے اپنے معنی پر رہے۔ رکعت اپنے معنی پر اور سجدہ اپنے معنی پر۔ رہا اس کا اخیر کا ٹکڑا یعنی وَمَنْ فَاتَتْهُ اُمُّ الْقُرْاٰنِ فَقَدْ فَاتَهٗ خَيْرٌ كَثِيْرٌ۔ یعنی جس سے فاتحہ فوت ہوگئی۔ اس سے خیر کثیر فوت ہوگئی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فاتحہ کوئی ضروری نہیں۔ اس کے بغیر بھی رکعت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خیر کا لفظ فرض واجب پر بھی بولا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے جو شخص پانی نہ پائے وہ تیمم سے نماز پڑھتا رہے۔ خواہ دس سال گذر جائیں جب پانی پائے تو اپنی جلد کو لگالے یعنی غسل کرے۔ فَاِنَّ ذٰلِكَ خَيْرٌ۔ کیونکہ یہ غسل اس کے لئے بہتر ہے دیکھئے یہاں غسل جنابت کو خیر کہا ہے۔ حالانکہ یہ فرض ہے۔ پس اسی طرح فاتحہ کو سمجھ لینا چاہیئے۔

اس کے علاوہ فاتحہ کے فوت ہونے کے یہ معنی نہیں کہ مقتدی فاتحہ پڑھ نہیں سکا۔ اور امام رکوع میں چلا گیا بلکہ فاتحہ کے فوت ہونے کے یہ معنی ہیں کہ مقتدی امام کی فاتحہ نہیں پا سکا۔ کیونکہ امام کی فاتحہ پانے کی صورت میں امام کے ساتھ آمین کہنے کا موقعہ ملتا ہے۔ جس سے حدیث فمن وافق تامينه تامين الملٰئكة غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ کا مصداق ہو جاتا ہے۔

یعنی جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو جائے۔ اس کے تمام سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور فرشتوں کی آمین امام کی آمین پر ہوتی ہے۔ چنانچہ ابوہریرہ سے جزء القراءۃ بخاری باب السکتات میں مروی ہے۔ اور مشکوٰۃ باب القراءۃ میں بھی ابوہریرہ رضہ کی حدیث ہے جس میں اس کا ذکر ہے پس امام کے ساتھ فاتحہ پانے سے اتنی بڑی فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ اور جس سے امام کی فوت ہوگئی۔ اس سے خیر کثیر فوت ہوگئی۔ اس لئے حضرت ابوہریرہ رضہ نے جب مروان بن حکم کے موذن کو شرط کی کہ ولا الضالین کے ساتھ مجھ سے سبقت نہ کرنی ہوگی۔ ملاحظہ ہو فتح الباری باب جہر الامام بالتامین۔

ساہروی نے تعاقب کیا ہے اور حضرت ابوہریرہ رضہ کے رکوع میں رکعت کے قائل ہونے کی بابت موطا امام مالک رہ کی یہ روایت پیش کی ہے۔

مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً فَقَدْ اَدْرَكَ السَّجْدَةَ وَمَنْ فَاتَهٗ اُمُّ الْقُرْاٰنِ فَقَدْ فَاتَهٗ خَيْرٌ كَثِيْرٌ۔

یعنی جس نے رکعت پائی اُس نے نماز پائی اور جس سے فاتحہ فوت ہو گئی اُس سے خیر کثیر فوت ہو گئی۔

لیکن مولوی عبدالجلیل کا اس روایت کو پیش کرنا غلطی ہے۔ کیونکہ اس میں رکعت اپنے معنی پر ہے اور سجدہ میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ بھی اپنے معنی پر ہو۔ دوسرا یہ کہ بمعنی نماز ہو۔ چنانچہ اس کی تفصیل امام زرقانی شرح موطا میں لکھتے ہیں۔ فَقَدْ فَاتَهُ خَيْرٌ كَثِيرٌ لِمَوْضِعِ التَّأْمِينِ وَمَا يَتَرَتَّبُ عَلَيْهِ مِنْ غُفْرَانِ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ قَالَهُ ابْنُ وَضَّاحٍ وَغَيْرُهُ (زرقانی جلد اول صفحہ) یعنی ابوہریرہ رضؓ کا یہ کہنا کہ جس سے فاتحہ فوت ہو گئی اُس سے خیر کثیر فوت ہو گئی اس کا مطلب آمین کا موقعہ پانا ہے۔ اور اس فضیلت کا حاصل کرنا جو آمین کا موقعہ پانے سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی تمام سابقہ گناہ کی معافی ہو جاتی ہے۔

اسی کے قریب حافظ ابن عبدالبر استذکار میں لکھتے ہیں۔ اور قاضی ابوالولید باجی منتقی شرح موطا میں لکھتے ہیں۔

عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَقُولُ مَنْ أَدْرَكَ الرَّكْعَةَ فَقَدْ أَدْرَكَ السَّجْدَةَ الْحَدِيث ـ مَعْنَى ذٰلِكَ أَنَّ مَنْ أَدْرَكَ الرَّكْعَةَ فَقَدْ أَدْرَكَ الْاِعْتِدَادَ بِالسَّجْدَةِ وَلَيْسَتْ فَضِيلَةُ مَنْ أَدْرَكَ الرَّكْعَةَ دُونَ قِرَاءَةٍ كَفَضِيلَةِ مَنْ أَدْرَكَ الْقِرَاءَةَ مِنْ أَوَّلِهَا وَأَشَارَ مِنْ ذٰلِكَ إِلَى فَضِيلَةِ حُضُورِ قِرَاءَةِ أُمِّ الْقُرْآنِ لِأَنَّهَا مِنْ أَعْظَمِ فَضِيلَةِ قِرَاءَةِ الرَّكْعَةِ وَقَدْ قَالَ ابْنُ وَضَّاحٍ كَالَّذِي ادَّعَى إِنَّ تِلْكَ الْفَضِيلَةَ قَوْلُ الْمَأْمُومِ آمِينَ عِنْدَ قَوْلِ الْإِمَامِ وَلَا الضَّالِّينَ لِمَا رُوِيَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ لَا تَسْبِقْنِي بِآمِينَ فَثَبَتَ بِذٰلِكَ أَنْ لَا ذَلِكَ هٰذَا الْمَوْضِعِ مِنَ الْقِرَاءَةِ فَزِيَّةٌ عَلَى غَيْرِهِ إِلَّا أَنَّ ظَاهِرَ قَوْلِهِ هٰهُنَا يَقْتَضِي أَنَّ الْفَضِيلَةَ الَّتِي أَدْرَكَ إِنَّمَا هِيَ بِجَمِيعِ قِرَاءَةِ أُمِّ الْقُرْآنِ لِأَنَّ حُضُورَ قِرَاءَةِ جَمِيعِهَا فَضِيلَةٌ يَتَحَصَّلُ فِيهَا فَضِيلَةُ إِدْرَاكِ آمِينَ وَغَيْرِهَا وَفِي هٰذَا الْأَثَرِ مَعْنًى آخَرُ وَهُوَ أَنَّ مَنْ جَاءَ فَوَجَدَ الْإِمَامَ رَاكِعًا كَبَّرَ وَرَكَعَ وَلَمْ يَقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ وَيَتَّبِعُ الْإِمَامَ بَعْدَ رَفْعِ رَأْسِهِ مِنَ الرُّكُوعِ وَلِذٰلِكَ وَصَفَهُ بِأَنَّهُ قَدْ فَاتَتْهُ قِرَاءَةُ الْقُرْآنِ وَلَوْ كَانَ مِنْ حُكْمِهِ أَنَّ الْقِرَاءَةَ بِأُمِّ الْقُرْآنِ قَبْلَ اتِّبَاعِ

الْإِمَامِ لَمَّا وَصَفَ بِفَوَاتِ ذَالِكَ كَمَا لَا يُوصَفُ بِفَوَاتِ تَكْبِيرَةِ الْإِحْرَامِ۔

(کتاب المنتقی شرح موطاء قاضی ابو الولید الباجی جلد اوّل صفحہ)

یعنی ابو ہریرہ رضہ کی روایت کے یہ معنی ہیں کہ جس نے رکعت پالی اس کا سجدہ بھی معتبر ہو گیا۔ اور جس نے قرأت ام القرآن کے بغیر رکعت پائی اس کی فضیلت ایسی نہیں جیسی شروع رکعت پانے والے کی ہے۔ اور اس سے قرأۃ ام القرآن امام کے ساتھ پانے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ قرأۃ رکعت کی بڑی فضیلت یہی ہے کہ ام القرآن کو امام کے ساتھ پالے اور ابن وضاح اور داؤدی نے کہا ہے کہ یہ فضیلت مقتدی اور امام کی آمین میں موافقت کے لئے ہے۔ کیونکہ ابو ہریرہ رضہ سے مروی ہے کہ انہوں نے امام کو کہا۔ مجھ سے آمین کے ساتھ سبقت نہ کرنا۔ اس سے ثابت ہوا کہ امام کی قرأۃ کے اس حصہ کو پانا جس سے آمین میں موافقت ہو جائے بہ نسبت دوسری قرأت کے زیادہ فضیلت ہے لیکن ظاہر قول ابو ہریرہ رضہ کا ساری فاتحہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کے ضمن میں آمین کی موافقت بھی آجاتی ہے کیونکہ جو ساری فاتحہ امام کے ساتھ پائے وہ آمین کا موقع ولا الضالین بھی پالے گا۔ اور ابو ہریرہ رضہ کے اس قول کا ایک اور معنی بھی ہے۔ وہ یہ کہ جو امام کو رکوع میں پائے وہ امام کے ساتھ تکبیر کہہ کر شامل ہو جائے اور رکوع کرے اور اُم القرآن نہ پڑھے اور رکوع سے سر اٹھا کر سجدہ میں امام کی اتباع کرے۔ اسی لئے اس کی بابت فاتحہ کے فوت ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اگر اس شخص کا یہ حکم ہوتا کہ امام سے پہلے فاتحہ پڑھ لے تو اس کی بابت فاتحہ کے فوت ہونے کا ذکر نہ ہوتا جیسے تکبیر تحریمہ کے فوت ہونے کا ذکر نہیں کیا۔

قاضی ابو الولید نے اس عبارت میں ابو ہریرہ رضہ کی روایت کے دو مطلب بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ امام کے ساتھ رکعت پائے تو سجدہ کا اعتبار بھی ہو سکتا ہے ورنہ نہیں اور امام کے ساتھ فاتحہ سمیت رکعت کا پانا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ اور اس میں آمین میں بھی موافقت ہے۔ اگر امام کے ساتھ فاتحہ سمیت رکعت نہ پائی بلکہ امام کے فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد آکر شامل ہوا تو پھر خواہ فاتحہ پڑھ بھی لی لیکن جو امام کے ساتھ فاتحہ پانے کی فضیلت تھی وہ فوت ہو گئی۔

دوسرا مطلب قاضی ابو الولید نے یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص امام کو رکوع کی حالت میں پائے تو رکوع سے سر اٹھا کر امام کی تابعداری کرے اور فاتحہ اس سے فوت ہو گئی۔ یعنی اس کے پڑھنے کا موقع جاتا رہا۔ اس صورت میں بھی (باوجود رکعت یعنی رکوع ہونے کے) رکوع میں رکعت ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ

اس سے اس بات کا بیان کرنا مقصود ہے کہ امام کو جس حالت میں پائے اس کے ساتھ مل جائے۔ اس سے پہلے جو کچھ رہ گیا، وہ رہ گیا۔ اب اس کو امام کی اقتدا کے وقت اتباع امام سے پہلے نہیں ادا کر سکتا۔ بعد کو ادا کرے۔ اگرچہ امام کے ساتھ ادائیگی کی فضیلت بہت تھی مگر وہ فوت ہو گئی۔ ہاں تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہوتی اس کو امام سے الگ کہہ کر پھر امام کے ساتھ اس حال میں شامل ہو جائے جس حال میں امام ہو۔

غرض اس قسم کے کئی مطالب ابوہریرہؓ کے اس قول کے ہو سکتے ہیں۔ اس سے رکوع میں رکعت لازم نہیں آتی۔ خاص کر جب ابوہریرہؓ کا صریح فتویٰ رکوع میں رکعت نہ ہونے کا صحیح سندوں کے ساتھ موجود ہے تو پھر مخالف صورت کیوں اختیار کی جائے۔ حتی الوسع موافقت چاہیے۔ یہ دونوں باتیں (یعنی حتی الوسع موافقت اور قوت اسناد) رکوع میں رکعت نہ ہونے کو چاہتی ہیں۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

سجدہ کا بیان

ایک دوسرے کی پشت پر سجدہ

سوال:۔ اگر مسجد میں جگہ تھوڑی ہو۔ اور آدمی زیادہ ہوں تو کیا اتنی تنگ صفیں کر سکتے ہیں کہ پچھلی صفوں کے آدمی اگلے صفوں کے نمازیوں کی پشت پر سجدہ کر لیں یا کہ نہیں۔

حاکم علی گجراتی حال وارد ۲/۱ ڈاکخانہ اوکاڑہ ضلع منٹگمری

جواب:۔ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی پیٹھ پر بھی سجدہ کا کوئی حرج نہیں۔ (فصل رابع مشکوٰۃ وغیرہ)

عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم اہلحدیث روپڑ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ ۲۴ جون ۱۹۳۸ء

سجدہ کی صورت

سوال:۔ سجدہ کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ سجدہ کے وقت ہاتھ زمین پر پہلے رکھے جائیں یا گھٹنے؟

جواب:۔ اس میں اختیار ہے کہ ہاتھ پہلے ٹکائے یا گھٹنے۔ سجدہ سات اعضاء پر ہوتا ہے۔ دو پاؤں، دو ہاتھ، دو گھٹنے، ماتھا ناک سمیت۔

اپنے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھے اور ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں ایک دوسرے سے ملا کر قبلہ رخ کرے تاکہ چہرہ کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی سجدہ کریں۔ پگڑی کا پیچ یا ٹوپی وغیرہ ماتھے کے آگے سے ہٹادے۔ اگر زمین گرم ہو یا کوئی اور عارضہ ہو پھر ہٹانا ضروری نہیں۔ اور دونوں کہنیاں دونوں پہلوؤں سے ہٹا کر اور زمین سے اٹھا کر سجدہ کرے۔ اس طرح پشت کا اٹھانا اور پیٹ کا رانوں سے اور دونوں رانوں کا ایک دوسرے سے جدا رکھنا بھی ضروری ہے لیکن عورت کے متعلق بعض حدیثوں میں استثناء آتی ہے کہ عورت پیٹھ نہ اٹھائے، بلکہ رانوں سے ملالے۔ اگرچہ ان احادیث میں کچھ کلام ہے لیکن ان کے موید ات بھی ہیں اس لئے ان پر عمل ہو سکتا ہے۔

حضرت ام سلمہؓ مردوں کی طرح نماز پڑھا کرتی تھیں۔ پس عورت اگر مردوں کی طرح نماز پڑھے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ اس طرح کھل کر کرتے کہ دنبے کا بچہ نیچے سے گزر سکتا۔ درندہ کی طرح ہاتھ بچھا کر سجدہ نہیں کرنا چاہیئے۔

سجدہ میں دونوں پاؤں کھڑے کر کے پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ کرے تاکہ باقی اعضاء کے ساتھ ان کا بھی سجدہ ہو۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

سجدہ میں تلاوت قرآن کی ممانعت اور تسبیح کی تعداد

سوال:۔ سجدہ میں قرآن مجید یا اس کی دعا پڑھ سکتا ہے اور تسبیح کی تعداد کم از کم کتنی ہے؟

جواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رکوع و سجدہ میں قرآن مجید نہ پڑھو۔ رکوع میں خدا کی تعظیم کرو۔ اور سجدہ میں دعا کی کوشش کرو۔ کیونکہ سجدہ میں دعا قبول ہوتی ہے۔

اس حدیث کے مطابق رکوع میں ظاہر دعا منع معلوم ہوتی ہے مگر حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبحانک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی بھی بہت کہتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا منع نہیں۔ پس اس حدیث کا یہ مطلب ہوگا کہ رکوع میں اصل تعظیم ہے۔ دعا کی اس میں زیادہ کوشش نہ کی جائے اور سجدہ میں دعا کی کوشش کرنی چاہیئے مگر چونکہ رکوع سجدہ میں قرآن پڑھنے سے ممانعت ہے۔ اس لئے

قرآنی دُعاؤں سے احتراز کرے۔ اگرچہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ قرآن کی دُعا تلاوتِ قرآن مجید کی نیت سے پڑھے تو وہ قرآن کا حکم رکھتی ہے۔ اِس نیت سے رکوع و سجدہ میں قرآنی دُعا نہ پڑھی جائے اور اگر دعا کی نیت سے پڑھے تو اس لحاظ سے وہ قرآن نہیں۔ رکوع اور سجدہ میں پڑھ سکتا ہے مگر چونکہ اس بارہ میں حضرت کوئی روایت نہیں آئی۔ صرف بعض علماء کی رائے ہے۔ اِس لئے قرآنی دعا سے پرہیز مناسب ہے۔ احادیث میں بکثرت دعائیں آئی ہیں۔ انہی پر اکتفا کرے۔ اگر کسی کو اور دُعا یاد نہ ہو تو مذکورہ بالا دعا ہی کافی ہے۔

سجدہ کی تسبیحات کا اندازہ دس تسبیح قدر ہونا چاہیئے۔

اور ایک ضعیف روایت میں کم از کم تین مرتبہ بھی آیا ہے۔

فصل رابع مشکوٰۃ میں ہے حضرت علی رض فرماتے ہیں، اگر کوئی موقع سخت مجبوری کا ہو تو تسبیح ایک مرتبہ ہی کافی ہے بشرطیکہ بغیر کرتستی سے کہے۔

سجدہ میں منع کی صُورت

سوال:۔ سجدہ میں وہ کونسی صورت یا حالت ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔

جواب:۔ جب سجدے سے سر اٹھائے اور دونوں ہاتھ دونوں رانوں پر یا گھٹنوں پر رکھے۔ اور بایاں پاؤں بچھا کر اس کے اوپر بیٹھ جائے اور دایاں پاؤں انگلیوں کے بل کھڑا کرکے ایڑیوں پر بیٹھ جائے۔ تو یہ بھی جائز ہے۔ اس کو اقعاء کہتے ہیں۔ ایک قسم اقعاء کی منع ہے اور وہ یہ ہے کہ گھٹنے کھڑے کرکے چوتڑ ایڑیوں کے ساتھ لگا کر ہاتھ زمین پر ٹیک کر بیٹھے یہ کتے کی بیٹھک ہے۔ اِس لئے منع ہے۔ اور اقعاء کی اس قسم کو عقبۃ الشیطان بھی کہتے ہیں۔ اقعاء کی پہلی صورت اگرچہ جائز ہے لیکن بایاں پاؤں بچھا کر اس کے اُوپر بیٹھنے کی صورت بہتر ہے۔ کیونکہ زیادہ احادیث میں اس کا ذکر ہے۔

درُود میں "علی سیدنا" کا اضافہ

سوال:۔ زید کہتا ہے۔ اللّٰھم صلِ علی سیدنا محمّد وعلیٰ اٰل سیدنا محمد و بارک وسلّم یہ درُود پڑھنا جائز نہیں کیونکہ سیّد کا لفظ کسی حدیث میں نہیں آیا۔ اس واسطے یہ منع ہے۔ عمرو کہتا ہے کہ یہ درُود پڑھنا جائز و درست ہے۔ سیّدنا کا لفظ شرافت و فضیلت کے لئے پڑھے تو کوئی منع نہیں (صفحہ ۱۵)

جواب :۔ حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ تلبیہ میں بعض الفاظ اپنی طرف سے زیادہ کر دیا کرتے تھے۔ امام شافعی رح کہتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ نے جو کچھ زیادہ کیا۔ وہ جائز ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظ پر اکتفا و کرنا مجھے زیادہ محبوب ہے۔ اس بنا پر اگر جائز لفظ بڑھالے تو کوئی حرج نہیں۔ ہاں بہتر آپ کے الفاظ پر اکتفا ہے اور سید کا لفظ آپ کے حق میں جائز ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

انا سید ولد ادم یوم القیمۃ (مشکوٰۃ باب فضائل سید المرسلین)

یعنی میں اولاد آدم کا سردار ہوں قیامت کے دن

اور ایک حدیث میں ہے صحابہؓ نے آپ کو سیدنا (ہمارے سردار) کہا تو فرمایا سید اللہ تعالیٰ ہے پھر صحابہؓ نے کہا آپ ہمارے افضل ہیں۔ تو فرمایا۔ یہ یا اس کا بعض کہو۔ (مشکوٰۃ باب المفاخرہ فصل ۲) اس سے معلوم ہوا کہ سید کا لفظ درود میں دو طرح سے بہتر نہیں۔ ایک تو فی نفسہ بہتر خیال نہیں کیا دوم آپ کے الفاظ پر اکتفا نہیں کیا۔ خیر جواز میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ زیادہ نہ کرے۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۱۲ر شوال ۱۳۵۸ھ - ۲۲ر نومبر ۱۹۳۹ء

درود پڑھنے سے کیا مراد ہے

سوال :۔ زید درود پڑھنے کے یہ معنی بیان کرتا ہے کہ موجودہ دور کا مسلمان اپنے درود کی طرف توجہ کرے کہ وہ درود جو صرف تسبیح کے دانوں یا سنگریزوں پر دہرایا جاتا ہے اور تمام زندگی ظلمات میں گزر جاتی ہے۔ یا خود نبی کی راہ میں ظلمات پیدا کی جاتی ہیں۔ اس کے کیا معنی ہیں۔ خدا تعالیٰ کا الصلوٰۃ کا عمل دعوتِ النبی کے ساتھ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے سے تاریکیوں کو دور کر کے نور کی طرف لے جاتا ہے ایسا ہی فرشتوں کا عمل الصلوٰۃ بھی سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں مخالفوں کی ہر ظلمت کا مقابلہ کر کے نور کی تائید کرتا ہے۔ مسلمانوں کو بھی چاہیئے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ الصلوٰۃ کا عمل اس طرح دکھائے کہ ہر قسم کی ظلمات کو آپ کی راہ دین اسلام سے دور کرے نہ خود ظلمات کا مرتکب اور حامل ہو اور نہ اوروں کو ظلمات کا مرتکب اور حامل ہونے دے۔ یعنی اپنی زندگی بھی نور سے بھر پور ہو۔ اور اوروں کو بھی نور سے بھر پور کرے۔ یہی "الصلوٰۃ علی النبی" ہے۔ کیا اس کے

پیچھے نماز جائز ہے۔

قاضی محمد نواز سکنہ واچل ضلع ڈیرہ غازی خان

جواب :- یہ شخص التحیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا درود پڑھتا ہے یا نہیں۔ اگر پڑھتا ہے تو اس سے خود بخود اس کے خیال کی تردید ہو گئی۔ اگر نہیں پڑھتا تو یہ شخص گمراہ اور ملحد ہے امامت کے قابل نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا منکر ہے۔ نیز قرآن مجید میں ہے۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

یعنی اے محمد! تو ان پر درود پڑھ بے شک تیرا درود ان کے لئے تسلی کا باعث ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔

اگر درود کا معنی تاریکی کا دور کرنا ہو تو پھر اس کہنے کا کیا مطلب ہوگا کہ تیرا درود ان کے لئے تسلی ہے۔ ہاں درود کے معنی دعا کے یا رحمت بھیجنے کے ہوں تو پھر مطلب واضح ہے۔ یہ شخص دراصل حدیث کا منکر قرآن مجید کا محرف ہے۔ اس کی اقتداء فی الصلوٰۃ تو کجا اس کو امامت سے کلیۃً علیحدہ کر دینا چاہیئے۔ خدا ایسے ملحدوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم روپڑ انبالہ

(مورخہ ۱۰ محرم ۱۳۶۰ھ)

آخر قعدہ میں درود شریف پڑھنا

سوال :- درود شریف آخری تشہد میں پڑھنے کا ثبوت صریحاً کس حدیث میں ہے؟

جواب :- عن رفاعة بن رافع عن النبي صلى الله عليه وسلم قال اذا قمت في صلوٰتك فكبر ثم اقرأ ما تيسر عليك من القران فاذا جلست في وسط الصلوٰة فاطمئن وافترش فخذك اليسرى ثم تشهد۔ رواه ابوداؤد

(منتقى باب الامر بالتشهد الاول)

یعنی رفاعہ بن رافع سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تو اپنی نماز میں کھڑا ہو تو تکبیر کہہ۔ پھر قرآن سے جو آسان ہو پڑھ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ فاتحہ پڑھ اور جو خدا چاہے۔ جب تو درمیان نماز کے قعدہ کرے تو اطمینان سے بیٹھ اور اپنی بائیں ران بچھالے پھر تشہد پڑھ۔

تلخیص الحبیر میں ہے۔

وروی احمد وابن خزیمۃ من حدیث ابن مسعود ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علمہ التشہد فکان یقول اذا جلس فی وسط الصلوٰۃ و فی اخرھا علی ورکہ الیسری التحیات الی قولہ عبدہ و رسولہ قال ثم ان کان فی وسط الصلوٰۃ نہض حین یفرغ من تشہدہ وان کان فی آخرھا دعا بعد تشہدہ بما شاء اللّٰہ ان یدعو ثم یسلم۔ (باب صفۃ الصلوٰۃ)

امام احمد رح اور امام ابن خزیمہ رح نے ابن مسعود رض سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تشہد سکھایا۔ پس جب وہ درمیانہ قعدہ میں بیٹھتے اور آخر قعدہ میں بیٹھتے تو بائیں ران پر بیٹھتے اور التحیات عبدہ ورسولہ تک پڑھتے۔ پھر اگر درمیانے قعدہ میں ہوتے تو صرف تشہد پڑھ کر کھڑے ہو جاتے۔ اور اگر اخیر میں ہوتے تو تشہد کے بعد جو خدا چاہے دعا مانگتے پھر سلام پھیرتے۔

نیل الاوطار اور مشکوٰۃ شریف میں ہے۔

عن فضالۃ بن عبید قال بینما رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قاعداذ دخل رجل فصلی فقال اللھم اغفرلی وارحمنی فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عجلت ایھا المصلی اذا صلیت فقعدت فاحمد اللّٰہ بما ھو اھلہ وصل علی ثم ادعہ قال ثم صلی رجل آخر بعد ذالک فحمد اللّٰہ وصلی علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال لہ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ایھا المصلی ادع تجب۔ رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی نحوہ

(المشکوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم)

یعنی فضالہ بن عبید رض سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے۔ اس حال میں ایک شخص مسجد میں داخل ہوا نماز پڑھ کر اس نے کہا کہ اے اللہ! مجھے بخش اور رحم کر۔ آپ نے فرمایا۔ اے نمازی! تو نے جلدی کی جب تو نماز پڑھ چکے پس بیٹھے تو پہلے خدا کی شان کے لائق خدا کی تعریف و ثنا کر اور مجھ پر درود بھیج پھر دعا مانگ۔ اس کے بعد ایک شخص نے نماز پڑھی۔ پس اس نے خدا کی تعریف کی اور آپ پر درود پڑھا۔ آپ نے اس کو فرمایا اے نمازی دعا کر قبول ہوگی۔

نیل الاوطار میں بحوالہ حاکم اور بیہقی لکھا ہے۔

عن رجل من آل الحارث عن ابن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اذا تشہد احدکم فی الصلوۃ فلیقل الحدیث۔

یعنی ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب ایک تمہارا نماز میں تشہد پڑھ چکے تو چاہیئے کہ کہے یعنی درود پڑھے۔

اس روایت میں اگرچہ عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرنے والا راوی مجہول ہے۔ مگر عبداللہ بن مسعودؓ کی گزشتہ روایت اس کی مؤید ہے۔ ان سب روایتوں کے ملانے سے ثابت ہوا کہ پہلے قعدہ میں درود و دعا نہیں بلکہ یہ صرف آخری قعدہ میں ہے۔

اس کے علاوہ اور سنئے۔ منتقی میں ہے۔

عن ابی ھریرۃ رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا فرغ احدکم من التشہد الاخیرۃ فلیتعوذ من اربع من عذاب جہنم ومن عذاب القبر ومن فتنۃ المحیا والممات ومن شر المسیح الدجال رواہ الجماعۃ الا البخاری والترمذی (باب یدعو بہ فی آخر الصلوۃ)

ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ایک تمہارا تشہد اخیر سے فارغ ہو تو چار چیزوں سے پناہ مانگے۔ عذاب جہنم اور عذاب قبر۔ فتنہ حیات و موت۔ فتنہ دجال سے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخری تشہد کے بعد یہ دعا چاہیئے اور فضالہ رض کی گزشتہ حدیث میں ہے کہ دعا سے پہلے درود چاہیئے۔ پس اخیری تشہد کے بعد ایک اور طرح سے بھی درود ثابت ہو گیا۔

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۷ رجب سنہ ۱۳۵۹ھ ۔ ۱۲ اگست سنہ ۱۹۴۰ء

آخر التحیات میں چوتڑوں پر بیٹھنا

سوال:۔ مولوی اشرف علی تھانوی رح نے لکھا ہے کہ قعدہ اخیر میں اس طرح بیٹھیں جس طرح

قعدہ اولیٰ میں بیٹھتے ہیں۔ ۔اور ان دونوں قعدوں میں کوئی فرق نہیں جیسا کہ مسلم۔ ترمذی۔ نسائی کی احادیث میں ہے کہ دایاں قدم کھڑا کرو۔ اور اس کی انگلیاں قبلہ کی طرف کرو اور بائیں پر بیٹھو۔ وغیرہ وغیرہ کیا ان کا یہ فرمان درست ہے؟

جواب۔ ان لوگوں کی عجیب حالت ہے کہ خیانت بھی کرتے ہیں۔ پھر تصریحات کو چھوڑ کر اشاروں کنایوں سے کام لیتے ہیں۔ دیکھئے ترمذی۔ ابوداؤد وغیرہ میں دونوں قعدوں میں فرق کی تصریح ہے۔ ابی حمیدؓ نے دس صحابہؓ میں جن میں ابوقتادہؓ۔ ابواسیدؓ۔ سہل بن سعدؓ۔ محمد بن مسلمہ بھی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی کیفیت ذکر کی جس میں دونوں قعدوں میں فرق بیان کیا۔ ان دسوں نے تصدیق کی اور کہا کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اس طرح تھی۔ فرق یوں بیان کیا کہ پہلے قعدہ میں ایک پاؤں کھڑا کیا اور دوسرا پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھ گئے۔ اور اخیری قعدہ میں دونوں پاؤں دائیں طرف نکال کر چوتڑوں پر بیٹھ گئے۔

ہم ان روایتوں کے منکر نہیں جو مولوی اشرف علی نے ذکر کی ہیں۔ ہم اس قعدہ کو سنت سمجھتے ہیں جو ان روایتوں میں مذکور ہے۔ صرف اتنا کہتے ہیں کہ چونکہ ان روایتوں میں تصریح نہیں کہ یہ کونسا قعدہ ہے۔ اور دس گیارہ صحابہؓ کی روایت میں تصریح ہے۔ اس لئے ان روایتوں کے قعدہ کو اول قعدہ پر حمل کیا جائے گا۔ پس اس طرح سب روایتوں میں موافقت ہو جائے گی۔ اور اگر بعض کو بعض پر ترجیح دی جائے تو بھی صریح غیر صریح پر مقدم ہے۔ خصوصاً جب کہ اس کے نقل کرنے والے دس گیارہ صحابہؓ ہیں۔ رہا کسی کا ان میں سے منسوخ ہونا سو وہ تاریخ معلوم ہونے پر ہے۔ اور یہاں تاریخ معلوم ہی نہیں بلکہ اگر تاریخ معلوم بھی ہو تو حتی الامکان جمع بہتر ہے کیونکہ دلیل پر عمل کرنا دلیل کے بے کار کرنے سے بہتر ہے۔

علاوہ ازیں اور سنئے موطا امام مالکؒ میں عبداللہ بن عمرؓ سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا کرکے اور بایاں پاؤں بچھا کر چوتڑوں پر بیٹھتے۔ اور موطا میں عبداللہ بن دینار سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کا چوتڑوں پر بیٹھنا قعدہ اخیر میں تھا۔ اب جو روایت مولوی اشرف علی نے نسائی سے ذکر کی ہے اس کی بابت یا تو یہ کہنا چاہئے کہ اس میں اختصار ہے جو موطا کی روایت سے ظاہر ہو گیا۔ اس صورت میں بقاعدہ الاحادیث یفسر بعضہا بعضا۔ یہ دونوں حدیثیں ایک ہو جائیں گی اور دونوں سے قعدہ اخیر مراد ہوگا یا نسائی کی روایت کو قعدہ اولیٰ پر محمول کیا جائے اور موطا کی روایت کو قعدہ اخیرہ پر حمل کیا جائے۔ اس صورت میں دونوں حدیثیں الگ الگ ہوں گی اور دونوں سے الگ الگ مسئلہ ثابت ہوگا۔ عبداللہ امرتسری روپڑی

فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

سوال:۔ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ جو امام فرض نماز پڑھ کر دعا نہ مانگے اور فوراً چلا جائے تو اس کی کیا فضیلت ہے؟

جواب:۔ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر جو دعا مانگی جاتی ہے وہ شرعاً درست ہے۔ بعض روایات میں اس کی تصریح بھی پائی جاتی ہے، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ابو اسود عامری سے مروی ہے۔

عَنْ اَبِی الْاَسْوَدِ الْعَامِرِیِّ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ صَلَّیْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْفَجْرَ فَلَمَّا سَلَّمَ انْحَرَفَ وَرَفَعَ یَدَیْهِ وَدَعَا۔ الحدیث۔ رواہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ۔

یعنی ابو اسود عامری۔ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے فجر کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھی تو آپ نے سلام کے بعد ہاتھ اٹھائے اور دعا کی۔

یہ حدیث ضعیف ہے مگر اور روایاتِ عامہ فی الدعاء سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس لئے جوازِ رفع یدین فی الدعاء بعد الصلوٰۃ المفروضہ میں کسی کو کلام نہیں۔ ہاں جو لوگ بعض نماز فرض ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں یہ ضرور بدعت کے مرتکب ہیں کیونکہ شرع میں جس امر کا وجوب و ضروری ہونا کسی دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو اور اس کو ضروری قرار دیا جائے تو وہ ضرور بدعت ہوتا ہے۔ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھانا ضروری طور سے کسی روایت مرفوع صحیح، حسن سے ثابت نہیں۔ پس فی زمانہ جب کہ عام لوگ رفع الیدین فی الدعاء کو بعد نماز فرض ضروری سمجھتے ہیں تو نہ اٹھانا ہی افضل ہے ورنہ جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اس لئے علامہ حافظ ابن القیم رہ فرماتے ہیں۔

واما الذی بعد السلام من الصلوٰۃ مستقبل القبلۃ او الی المقتدین فلم یکن من هدیه صلی اللّٰه علیه وسلم اصلا ولا روی عنه باسناد صحیح ولا حسن (زاد المعاد جلد ۱)

یعنی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ (مسترہ) نہ تھا کہ آپ بعد سلام کے دعا کو قبلہ کی طرف یا مقتدیوں

کی طرف منہ کر کے کرتے ہوں اور نہ ایسا کسی صحیح حسن حدیث میں آیا ہے۔ واللہ اعلم

ابو محمد عبد الجبار مدرس مدرسہ دار الحدیث کھنڈیلہ جے پور

محدث روپڑی ؒ۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کے متعلق اخبار تنظیم میں کئی بار مضمون شائع ہو چکا ہے اور تعدد طرق کی بنا پر بعد نماز ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی حدیث کو ہم نے حسن ثابت کیا ہے بلکہ بعض اسانید حسن لذاتہ ہیں۔ اس لئے ہاتھ اٹھانے میں کوئی خدشہ نہیں بلکہ استحباب ہے۔ ہاں لازمی سمجھنا بری بات اور بدعت ہے۔ اصلاحی طور پر انسان کو ایسا کرنا چاہیئے کہ کبھی اٹھائے اور کبھی نہ اٹھائے تاکہ لوگوں کو عملی رنگ میں تبلیغ ہوتی رہے اور اس کے ضروری ہونے کا خیال ان کے دلوں سے نکل جائے کیونکہ عوام الناس ذرا سختی سے اس کی پابندی کرتے ہیں اور نہ اٹھانے والے پر اعتراض کرتے ہیں بلکہ دوسرے بعض خواص بھی اس میں مبتلا ہیں اس لئے دوام میں نقصان ہے۔

عبد اللہ امرتسری روپڑی

۲۳ جمادی الاول ۱۳۶۰ھ

سوال: نماز کے بعد ہاتھ اٹھانے کے متعلق کوئی صحیح حدیث نہیں تو پھر جو لوگ دعا مانگتے ہیں۔ وہ بدعت کے مرتکب نہیں ہیں؟۔

جواب:۔ مشکوٰۃ میں ہے۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قِیْلَ اَیُّ الدُّعَاءِ اَفْضَلُ قَالَ جَوْفَ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ وَدُبُرَ الصَّلٰوةِ الْمَكْتُوْبَاتِ۔ (رواہ الترمذی)

یعنی ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کونسی دعا زیادہ سنی جاتی ہے۔ فرمایا اخیر رات میں اور فرض نمازوں کے بعد۔

اس حدیث میں فرضوں کے بعد دعا مانگنے کا ذکر ہے اور خاص قبولیت کے اوقات میں شمار کیا ہے رہا ہاتھ اٹھانا، سو اس کی بابت سیوطی ؒ نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں چالیس سے اوپر حدیثیں دعا میں ہاتھ اٹھانے کی بابت لائے ہیں۔ چنانچہ وہ رسالہ سبل السلام شرح بلوغ المرام کے آخر میں ملحق ہو کر طبع ہو چکا ہے اور مفتی کے اوپر بھی ایک رسالہ چھپا ہوا ہے جو اس سوال کا تسلی بخش جواب ہے۔ یہ رسالہ سید علامہ محمد عبد الرحمٰن بن سلیمان زبیدی یمانی ؒ کا ہے۔ خلاصہ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانے کی بابت عام حدیثیں بھی آئی ہیں۔ اور خاص بھی عام حدیثوں سے ایک یہ حدیث ہے جس کو ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ ابن حبان اور حاکم

نے سلمان رضہ سے روایت کیا ہے کہ جب بندہ اللہ تعالٰے کے سامنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اللہ تعالٰے شرم کرتا ہے کہ خالی موڑے۔

اس حدیث کو ترمذی نے حسن کہا ہے اور حاکم نے بخاری مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری باب رفع الیدین فی الدعا میں اس حدیث کی بابت کہا اس کی اسناد جید یعنی کھری ہے اور اسی طرح کی حدیث حاکم نے انس رضؓ سے روایت کی ہے اس کو بھی حاکم نے صحیح کہا ہے۔ مسند احمد اور ابوداؤد میں مالک بن یسار رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم اللہ تعالٰے سے سوال کرو تو ہاتھوں کے اندر سے سوال کرو نہ پیٹھوں سے اور جب فارغ ہو تو ہاتھ منہ پر مل لیا کرو۔ اور ترمذی میں عمر بن خطاب رضہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتے تو اُن کو نیچا نہ کرتے جب تک منہ پر نہ مل لیتے۔ اور خاص حدیثوں سے ایک حدیث یہ ہے جس کو ابن سنی نے اپنی کتاب عمل الیوم واللیلۃ میں انس رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ ہر نماز کے بعد ہاتھ پھیلا کر مندرجۂ ذیل دُعا پڑھے تو اللہ تعالٰے اُس کے ہاتھوں کو نامراد واپس نہیں کرے گا۔

اَللّٰهُمَّ اِلٰهِیْ وَاِلٰهَ ابراهیم واسحاق ویعقوب والٰہ جبریل ومیکائیل واسرافیل اسئلك ان تستجیب دعوتی فانی مضطر وتعصمنی فی دینی فانی مبتلی وتنالنی برحمتك فانی مذنب وتنفی عنی الفقر فانی متمسکن۔

اے اللہ میرے معبود۔ ابراہیم۔ اسحٰق۔ یعقوب کے معبود اور جبریل۔ میکائیل اسرافیل کے معبود میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو میری دعا قبول کر۔ کیونکہ میں لاچار ہوں۔ دین میں مجھے سایہ رحمت میں لے لے کیونکہ میں گنہگار ہوں۔ مجھ سے محتاجی دور کر کیونکہ میں مسکین ہوں۔

اس حدیث کی اسناد میں عبد العزیز بن عبد الرحمٰن ایک راوی ہے جس میں کچھ کلام ہے لیکن فضائل اعمال میں ضعیف غیر موضوع اور غیر متروک پر عمل درست ہے۔ چنانچہ ابن الہمام نے فتح القدیر کتاب الجنائز میں اس کی تصریح کی ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے نکت علی ابن صلاح میں لکھا ہے کہ ابن ماجہ کے شاگرد ابوالحسان قطان جو اہل عرب کے حفاظ محدثین سے ہیں۔ بیان وہم والہام میں فرماتے ہیں کہ ضعیف حدیث کے ساتھ فضائل اعمال میں عمل کیا جاتا ہے۔ اور امام نوویؒ نے اذکار میں کہا ہے کہ فضائل اعمال اور ترغیب وترہیب میں ضعیف حدیث کے ساتھ عمل جائز بلکہ مستحب ہے۔ اور امام نووی نے اپنی اربعین میں کہا ہے کہ

سب کا اس پر اتفاق ہے الامن سشذ مثل ابن العربی۔ اس کے علاوہ ایک اور حدیث اس کو تقویت دیتی ہے جو ابوبکر بن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اسود عامری کے باپ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی جب آپ نے سلام پھیرا تو ہماری طرف پھرے اور دونوں ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی۔ اور آئمہ حدیث نے ذکر کیا ہے کہ ضعیف حدیث ضعیف کے ساتھ مل کر معتبر ہو جاتی ہے اور امام جلال الدین سیوطی نے اپنے رسالہ فض الوعاء فی احادیث رفع الیدین فی الدعاء میں بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ کہا ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز سے پہلے دعا مانگ رہا ہے جب دعا سے فارغ ہوا تو عبداللہ بن زبیرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہوتے۔ راوی اس حدیث کے ثقہ ہیں۔

یہ اس رسالہ کا خلاصہ ہے اس طرح ایک فتویٰ وہ بھی ہے جو مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی اور علماء دہلی مولوی نذیر حسین صاحب اور ان کے صاحبزادے شریف حسین صاحب۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب مولوی عبدالرب صاحب اور مولوی احمد حسن صاحب مصنف احسن التفاسیر سب کا متفقہ فتویٰ ہے۔ رسالہ جرح و تعدیل تصنیف مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی کے آخر میں ملحق ہے۔ غرض اس خصوص میں کئی علماء نے رسائل اور کئی فتاوی لکھے ہیں۔ جن کا خلاصہ دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ضعیف سے استحباب ثابت ہو سکتا ہے اور اس پر عمل درست ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب ضعیف حدیث کی مؤید اور احادیث بھی ہوں تو پھر حدیث ضعیف ہر طرح سے لائق اعتبار ہو جاتی ہے۔ پس اب فرضوں کے بعد ہاتھ اٹھانے میں کوئی شبہ نہ رہا۔ ہاں اتنی بات ضروری ہے کہ کبھی کبھی ترک کر دینا مناسب ہے کیونکہ آج کل اسے لازم سمجھے بیٹھے ہیں۔ اور جب تک امام دعا نہیں مانگتا اس کے منہ کی طرف بیٹھے دیکھتے رہتے ہیں۔ اور اگر بغیر مانگے کھڑا ہوا تو اس کو برا مناتے ہیں بلکہ اعتراض کرتے ہیں خاص کر احناف میں تو اس کی بڑی پابندی۔ خواہ خالی ہاتھ اٹھا کر منہ پر مل لیں۔ مگر ملنے ضرور ہیں اور ختم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ساتھ کرتے ہیں حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں بلکہ دعا ختم آمین کے ساتھ کرنی چاہیے چنانچہ یہ احادیث سے ثابت ہے اس سے کم و بیش بالکل نہ کرنا چاہیے کیونکہ اللہ کی رضا رسول کی اتباع میں ہے نہ غیر کی اتباع میں۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی۔ الآیۃ

عبداللہ امرتسری روپڑی

۱۰ محرم ۱۳۸۰ھ۔ ۲۲ جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

مسئلہ طفیل اور طریقہ دعاء

سوال :۔ بوقت دعاء انبیاء اور اولیاء و بزرگان دین کا واسطہ دینا مثلاً زید بوقت دعا یہ کلمات کہے۔ " اے اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل یا سید عبد القادر جیلانی کے واسطے میرا فلاں کام کر دے یا میری دعا قبول فرما۔ کسی صحیح مرفوع حدیث میں ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا

سائل محمد شفیع خانپوری علاقہ بہاولپور
از مکہ معظمہ

دیوبندی جواب

یہ مسنون طریق نہیں ہے نہ ضروری ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ

اور گناہ بھی نہیں اگر سوال اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے اور اس واسطے کے ذکر کرنے کو قبولیت دعاء کے لئے ضروری نہیں سمجھتا تو جائز ہے۔ اور اگر یہ اعتقاد رکھے کہ بغیر اس واسطے کے ذکر دعا قبول نہیں ہوگی تو پھر واسطے کا ذکر کرنا ممنوع ہے۔ (محمد عبد اللہ درخواستی ناظم مدرسہ عربیہ خانپور)

دیوبندی جواب پر تعاقب

سوال :۔ مولوی عبد اللہ درخواستی کا فتویٰ ارسالِ خدمت ہے غالباً وہ کسی کے طفیل کے ساتھ دعاء کرنے کو بدعتِ حسنہ سمجھتے ہیں۔ آپ اس پر کچھ تفصیلی روشنی ڈالیں۔ اور اس طفیل کے مسئلہ میں بھی تحریر فرمائیں کہ دعا مانگنے کا مسنون طریقہ کیا ہے مکہ شریف میں مولوی عبد الحق صاحب سے سنا تھا وہ فرماتے تھے۔ دُعا مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے الحمد شریف پھر دعا پھر آمین اور پھر درود شریف۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟

(محمد شفیع از مکہ مکرمہ)

جواب :۔ اس طرح دعا کرنا بدعت ہے۔ کیونکہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں۔

حدیث میں ہے۔

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد (مشکوٰۃ)

یعنی جو کوئی ہمارے دین میں نیا کام جاری کرے جو دین میں نہیں وہ مردود ہے۔

اس مسئلہ کی تفصیل ہمارے رسالہ دعا بحرمت انبیاء میں ہے۔

اور دین میں بدعت حسنہ کا وجود ہی نہیں کیونکہ حدیث میں ہے۔

کل بدعۃ ضلالۃ

یعنی ہر بدعت گمراہی ہے۔

ہاں دین میں کوئی چیز ثابت ہو جیسے عثمانی (جمعہ کی پہلی) اذان پر اجماع ہو گیا۔ اور اجماع شرعی دلیل ہے۔ پس شرع میں اس کا وجود ثابت ہو گیا۔ چنانچہ اس کا ذکر فتح الباری میں ہے۔ اب لغوی معنیٰ سے اس کو بدعت کہا جا سکتا ہے نہ شرعی معنیٰ سے کیونکہ شرع میں اس کا وجود ہے۔

اس طرح پہلے کوئی کام ہوتا ہو اور کسی وجہ سے ترک ہو گیا ہو تو اس کو کوئی جاری کرے تو اس کو بھی لغوی معنیٰ سے بدعت کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے تراویح کو بدعت کہا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن نماز پڑھائی۔ پھر فرض کے خوف سے ترک کر دی۔ جیسے مسلم شریف میں ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سلسلہ وحی منقطع ہونے کی وجہ سے فرض کا خوف نہ رہا۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے جاری کر دیں۔

یہی معنیٰ ہے۔ من سن سنۃ حسنۃ فی الاسلام۔ الحدیث کا۔ یعنی اچھا طریق جو اسلام میں ثابت ہو اور کسی وجہ سے بند ہو گیا ہو کوئی اس کو جاری کر دے تو اس کے لئے اپنا اور جو اس پر عمل کرے ان سب کا ثواب ہے لیکن دین میں ایسا نیا کام جاری کرنا جو قرآن و حدیث سے ثابت نہ ہو وہ مردود ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایک تجدید دین ہے اور ایک احداث فی الدین۔ تجدید تو ایک شرعی بات کا اجراء ہے یا لوگوں کو دین کے لئے بیدار کرنا اور احداث فی الدین یہ ہے کہ جو امر قرآن و حدیث سے ثابت نہیں اس کو دین میں داخل کرنا۔ پہلا کام بہت اچھا ہے اس کی خاطر اللہ تعالےٰ ہر صدی کے سر پر ایسے لوگوں کو بھیجتا ہے جو دین کی تجدید کریں۔ اور دوسرا کام گمراہی ہے۔ اس لئے اس کو مردود فرمایا گیا۔ سائل کا سوال دوسرے سے ہے مجیب (مولوی عبداللہ درخواستی) نے اول کے ساتھ جواب دے دیا۔ اسی کو کہتے ہیں۔

سوال از آسمان جواب از ریسمان

خداوند تعالےٰ ہدایت نصیب فرمائے اور صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین

نوٹ:۔ طریقہ دعا جو مولوی عبدالحق صاحب نے بتایا ہے ٹھیک ہے۔ چنانچہ دعاء قنوت وتر میں درود شریف اخیر میں اور آمین بھی اخیر میں آئی ہے۔ چنانچہ ابوزہیر نمیری کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے دعا بہت عاجزی سے مانگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس شخص نے دعا کی قبولیت کو واجب کر لیا اگر ختم کرے۔ ایک شخص نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسولؐ! کس شے کے ساتھ ختم کرے۔ آپؐ نے فرمایا آمین کے ساتھ (مشکوٰۃ باب فی الصلوٰۃ فصل ثانی)

عبداللہ امرتسری روپڑی جامعہ اہل حدیث لاہور

۲۵ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ ۱۶ اگست ۱۹۶۳ء

نماز میں بعض امور کا ارتکاب

نماز کا توڑنا

سوال:۔ جماعت ہو رہی ہے۔ ایسے وقت ایک شخص کنوئیں میں گر پڑتا ہے یا کسی کے گھر آگ لگ جاتی ہے یا اس قسم کا کوئی اور حادثہ ہو جائے تو کیا نمازی نماز توڑ کر اس کی امداد کریں۔ یا نماز جاری رکھیں؟

حاکم علی گجراتی چک ۷/۱۰۳ ڈاکخانہ اوکاڑہ ضلع منٹگمری

جواب:۔ کسی کے کنوئیں میں گرنے کی خبر آجائے یا اس قسم کا کوئی اور حادثہ ہو جائے تو نماز توڑنے میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت ابوبرزہؓ نے سواری کے بھاگ جانے کے خطرہ سے نماز توڑ دی تھی ملاحظہ فصل رابع مشکوٰۃ۔

عبداللہ امرتسری روپڑ

۲۴ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ ۲۴ جون ۱۹۳۹ء

نماز میں کپڑا سنوارنا